مولانا مودودیؒ کی نثر نگاری

ڈاکٹر امتیاز احمد

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بیسویں صدی کی اہم ترین شخصیات میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں گونا گوں خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ کسی ایک شعبے کے مردِ میدان نہیں تھے بلکہ ان کی شخصیت میں جامعیت اور ہمہ گیری نظر آتی ہے۔ جدید اور قدیم علوم پر گہری اور ناقدانہ نظر رکھتے تھے اور ہر دور کے بنیادی ماٰخذ و مراجع کو انھوں نے پوری تفصیل کے ساتھ پڑھ لیا تھا اور محض پڑھا ہی نہیں، اسے ہضم بھی کر لیا تھا اور اس پر اپنا ناقدانہ نقطۂ نظر پورے دلائل کے ساتھ ثبت کر دیا تھا۔ ان کے زیرِ مطالعہ کتب کے صفحات پر ان کے حاشیے گواہی دیتے ہیں کہ پڑھنے والا عام قاری نہیں بلکہ بہت وسیع اور بلند و بالا ذہنی و علمی افق کا حامل اور صاحب علم و قلم شخص ہے۔

مولانا نے بالکل ابتدائی زمانے میں لکھنا شروع کیا اور جوں جوں تصنیف و تالیف کے میدان میں آگے بڑھتے گئے، اسی طرح مطالعے کی وسعت اور گہرائی کا اہتمام بھی کرتے رہے۔ مولانا مودودی عنفوانِ شباب ہی میں ایک کہنہ مشق قلم کار کی حیثیت سے صحافت کے میدان میں نمودار ہوئے اور خوب چمکے۔ انھوں نے متداول امور و معاملات اور روزمرہ مسائل پر بھی قلم اٹھایا لیکن بنیادی علوم قرآن و سنت، فقہ، عمرانیات، معاشیات، سیاسیات، سائنس اور فلسفے کے میدانوں میں بھی خوب علمی جولانیاں دکھائیں۔ کوئی بات کچی، ناپختہ اور بلا تحقیق نہیں لکھی۔

مولانا مودودیؒ اسلاف کے علمی ذخیرے کے بڑے قدردان تھے لیکن تقلیدِ جامد سے کوسوں دور۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ ہم عصر علما و فضلا، محققین اور ناقدین ہوں یا زمانہ قدیم کی مایہ ناز

اور محترم و مکرم شخصیات، مولانا نے سبھی کی تحریروں کو تنقیدی و تجزیاتی نظر سے دیکھا۔ اپنی رائے کا بے لاگ اظہار کیا مگر اخلاقی حدود، ادب و احترام اور اکرام انسانیت کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ یہ مولانا ہی کا کمال ہے کہ انتہائی اشتعال انگیز تحریروں بلکہ الزامات و اتہامات کے جواب میں بھی جذبات کی رو میں بہہ جانے یا غصے میں بہک جانے کا کوئی شائبہ ان کی تحریروں میں نظر نہیں آتا۔ وہ مفسر قرآن اور عالمِ دین ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب طرز ادیب بھی تھے۔ ان کے ہم عصر مستند ادبا و ناقدین نے ان سے اختلاف کے باوجود ان کے اس مقام کا اعتراف کیا ہے۔ مولانا مودودی نثر نگار تھے، شاعر نہیں۔ انھیں جوانی میں شعر و شاعری سے کچھ شغف رہا اور اشعار بھی کہے مگر سچی بات یہ ہے کہ جو عظیم کام ان کے پیش نظر تھا اور جس کے لیے اللہ نے انھیں منتخب کر لیا تھا، اس کے شایانِ شان کام کرنے کے لیے نثر نگاری پر ہی یکسوئی سے توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں اتنی سلاست، ابلاغ، اثر آفرینی اور قبولیت پائی جاتی ہے کہ نثر میں ایسی کمی محسوس نہیں ہوئی، جسے اشعار سے پورا کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

ناشر

پیش لفظ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بیسویں صدی کے ایک ممتاز مفکر و دانش ور، عظیم قائد و رہ نما اور صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ انھوں نے اپنے افکار و نظریات اور جذبات و خیالات کے ابلاغ کے لیے اردو نثر کو وسیلۂ اظہار بنایا اور فلسفہ و سیاست، تاریخ و صحافت، معیشت و معاشرت، تہذیب و ثقافت اور سیرت و شخصیت، نیز تفہیم القرآن اور شرحِ حدیث پر بے مثال علمی سرمایے سے اردو نثر کو مالا مال کیا۔

مولانا مودودی کی حیات و شخصیت، افکار و نظریات اور اسلامی خدمات پر کئی زبانوں میں کتابیں لکھی گئی ہیں اور دنیا کی دانش گاہوں میں مودودی فکر و دانش پر تحقیق بھی ہوئی ہے۔ لیکن ان کی ادبی خدمات یا اسلوب نگارش پر کم ہی لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر امتیاز کی زیر نظر تصنیف ''مولانا مودودیؒ کی نثر نگاری'' ایک ایسی کتاب ہے، جو مولاناؒ کی ادبی خدمات بالخصوص ان کے اسلوب نگارش کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالتی ہے۔

کوئی ادیب اپنے افکار و احساسات اور جذبات کو لفظوں کے انتخاب اور جملوں کی ترتیب سے مفہوم کا پیراہن دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اب اس کا تعلق مذہب و سیاست سے ہو، اخلاق و معاشرت سے، تہذیب و ثقافت سے یا مختلف طرح کے مسائل سے، بہ ہر حال ادیب کے رشحاتِ قلم ادب کا درجہ رکھتے ہیں۔

انسانی شخصیت کی تعمیر اور اس کے طرز و انداز کی تشکیل میں ماحول کا اہم کردار ہوتا ہے۔ جس ماحول میں انسان کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت ہوتی ہے، اس کے زیر اثر اس

کے اندرادراکی اسلوب (Cognitive style) کی تعمیر ہوتی ہے، جو اس کی شخصیت کا جز ولا ینفک بن جاتی ہے۔ اس کے سوچنے کا انداز، اس کا عمل اور اس کی گفتگو سب کچھ اسی اسلوب سے متاثر ہوتے ہیں۔ مولانا موصوف کی پرورش وتربیت جس علمی و مذہبی گھرانے میں ہوئی، جس پاکیزہ ماحول میں انھوں نے تعلیم مکمل کی اور جس طرح انھوں نے ذہن ساز کتابوں اور رسالوں کا مطالعہ ابتدا ہی میں کرلیا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ ان کا ادراکی اسلوب بھی اسی معیار کا تعمیر ہو، چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی نگارشات میں انھوں نے جس موضوع یا مسئلے پر اظہار خیال کیا، اس میں خوفِ خدا، محبت رسول اور تزکیۂ نفس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

ادیب اپنے خیالات واحساسات کو مخصوص اسلوب کے ذریعے قاری یا سامع تک پہنچانا چاہتا ہے۔ گویا کہ اسلوب کا بنیادی وصف ابلاغ ہے اور ابلاغ کا کمال یہ ہے کہ ادیب جو کچھ قاری کے سامنے پیش کرے، اس موضوع سے متعلق کوئی الجھاؤ یا اشکال باقی نہ رہے۔ بسا اوقات قاری کی رسائی ادیب کے فکر و خیال تک نہیں ہو پاتی اور ابلاغی خلا (Communication gap) پیدا ہوجاتا ہے۔ مولانا مودودی کی تصنیفات پر غور کرنے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ انھوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا، اس کے موافق طرز بیان اختیار کیا۔ اسی لیے مولانا کی تحریروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا بھی اور ایک دانش ور بھی بہ آسانی انھیں سمجھ لیتا ہے۔

مولانا مودودی نے بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کے لیے لکھا، مردوں اور عورتوں کے لیے لکھا، سیاسی لیڈروں، عالموں، صحافیوں، فلسفیوں اور اساتذہ کے لیے لکھا اور اپنی تحریر کو اس طرز پر رکھا کہ اس سے ہر کوئی استفادہ کرسکے۔ ایک ماہر نفسیات جب نفسیاتی مسئلوں کو چھیڑتا ہے تو اسے نفسیات کا طالب علم ہی سمجھ سکتا ہے۔ ایک فلاسفر کے فلسفیانہ موشگافیوں کو ایک فلسفی ہی سمجھ سکتا ہے، لیکن مولانا میں یہ خوبی تھی کہ نماز کی ترکیبوں پر جب وہ لکھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے قاری اسے عملی طور پر سمجھ رہا ہو۔ جب الجہاد فی الاسلام لکھتے ہیں تو جہاد کے متعلق بعض غلط تصورات کا ازالہ بھی ہوجاتا ہے۔ ''مسئلہ جبر وقدر'' پڑھ کر نہایت دقیق فلسفیانہ مسئلے کو بھی قاری بہ آسانی سمجھ لیتا ہے۔ قرآن فہمی کے لیے ''تفہیم القرآن'' ان کی شاہ کار تالیف ہے۔ دشوار سے دشوار فلسفیانہ موضوع و مسائل کے لیے بھی انھوں نے جو سادہ وشفاف اور شایستہ ونفیس اندازِ بیان اختیار کیا، اس کی نظیر اردو نثر نگاری کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

زیرنظر کتاب پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مولانا مودودی نے ایک پاکیزہ و صالح مقصد و عمل کے لیے اردو نثر کو وسیلۂ اظہار کے طور پر منتخب فرمایا تھا، اور اس میں کیا شک ہے کہ اس مقصدی ادب اور صالح لٹریچر نے تعمیرِ معاشرہ اور تطہیر سیرت و کردار سے لے کر ملکی و بین الاقوامی مسائل و مباحث میں بھی پاکیزگی و نفاست اور صالحیت و صلابت کے عناصر بھر دیے ہیں۔

پروفیسر عنایت اللہ
صدر شعبہ نفسیات
ڈین کلیّہ علومِ عمرانی
وی بی یونی ورسٹی، ہزاری باغ
(جھارکھنڈ)

باب اول: حیات اور شخصیت

خاندان

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا تعلق سادات اہل بیت کی معروف شاخ سلسلۂ مودودیہ سے تھا۔ ان کے جدِ امجد خواجہ قطب الدین مودود چشتیؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (اجمیری) کے پردادا پیر تھے۔ خواجہ اجمیری کے شیخ حضرت عثمان ہارونی، ان کے شیخ حضرت جامی شریف زندانی اور ان کے شیخ قطب الدین مودود چشتیؒ تھے۔ اس طرح خواجہ مودودؒ برعظیم میں سلسلۂ چشتیہ میں خاندان مودودیہ کے مورث اعلیٰ تھے۔

حضرت خواجہ مودودؒ کی اولاد میں سے خواجہ ابوالاعلیٰ مودودی چشتیؒ نے ہندستان کا رخ کیا۔ سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں انھوں نے اپنے ضعیف العمر والد کے ہمراہ آبائی وطن قصبہ چشت (خراسان) سے ہجرت کی اور کرنال کے نواح میں اقامت گزیں ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد خواجہ ابوالاعلیٰ مودودی چشتیؒ نے سلسلۂ رشد وہدایت کو منظم کیا۔ بادشاہ شاہ عالم کے زمانے میں ان کا خاندان دہلی آکر آباد ہوا اور چھٹی پشت تک وہیں آباد رہا۔ ۱۸۵۷ کے غدر سے دو برس قبل اسی خاندان کے سید حسن کے یہاں احمد حسن کی پیدایش ہوئی۔

سید احمد حسن کے والد گرامی سید حسن کی پرورش و پرداخت شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کے شاگرد مولوی رشید الدین کی آغوش میں ہوئی۔ سید حسن ایک صوفی منش، سخی اور فیاض شخص تھے۔ جاگیر سے ان کی آمدنی ڈیڑھ سو روپے ماہوار تھی۔ ۵۰ روپے گھر کے خرچ کے لیے رکھتے، ۵۰ روپے محلے کی تین مسجدوں کی نذر کر دیتے اور ۵۰ روپے حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ ان کا انتقال ایک سو تین برس کی عمر میں ۱۹۰۳ میں ہوا۔

ولادت

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ولادت ۳ رجب المرجب ۱۳۲۱ھ بہ مطابق ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ کو اورنگ آباد (دکن) میں ہوئی۔ والد ماجد نے آپ کا نام ابوالاعلیٰ رکھا۔ مولانا نے اپنے نام کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے لکھا ہے:

> چوں کہ اس نام کے ایک بزرگ پہلے بھی ہمارے خاندان میں گزر چکے تھے اور انھی کی ذات سے ہندستان میں ہمارے خاندان کا سلسلہ شروع ہوا تھا، اس لیے والد نے ان کے ارشاد کو قبول کیا اور یاد رکھا، چناں چہ جب میں پیدا ہوا، تو اسی نام سے مجھے موسوم کیا گیا۔(۱)

ابوالاعلیٰ کا تعلق سادات اہل بیت سے ہونے کی بنا پر ان کے نام سے پہلے سید اور سلسلۂ مودودیہ سے نسبت کے سبب اخیر میں مودودی کا اضافہ کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی جید عالم دین ہونے کی حیثیت سے لوگ انھیں 'مولانا' سے بھی خطاب کرتے تھے۔ اس طرح ان کا پورا نام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ہے لیکن انھوں نے اپنی تمام تحریروں میں صرف ابوالاعلیٰ لکھا ہے۔ یہ ان کی خاک ساری کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

والدین

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے والد محترم سید احمد حسن ۱۸۵۵ میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ابتدائی دور کے طالب علموں میں سے تھے۔ جب سرسید احمد خاں نے علی گڑھ میں مدرسہ قائم کیا تو انھوں نے اپنے خاندان اور رشتے داروں میں سے بہت سے لڑکوں کو چن کر اپنے مدرسے میں داخل کیا۔ چوں کہ سید احمد حسن کے گھرانے سے سرسید کی قرابت داری ہوتی تھی، اس لیے ان کا داخلہ بھی اسی مدرسے میں کرایا گیا۔

سید احمد حسن کے والد انگریزی تہذیب کے سخت مخالف تھے۔ ان کا گھرانا انگریزی طرزِ معاشرت کے خلاف اور مذہبی پیشوائی میں مشہور تھا۔ جب انھیں سید احمد حسن کے کرکٹ کھیلنے کی خبر معلوم ہوئی تو انھوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ان کا تعلیمی سلسلہ منقطع کرا دیا۔ بعد میں

---

(۱) مولانا مودودیؒ اپنی اور دوسروں کی نظر میں، مرتب: محمد یوسف بھٹہ، ص ۲۹

سید احمد حسن نے الٰہ آباد میں وکالت لی تعلیم حاصل کی۔ وہ میرٹھ، غازی آباد اور بلند شہر میں کئی برسوں تک وکالت کرتے رہے۔ ۱۸۹۶ میں ایک مقدمے کے سلسلے میں اورنگ آباد دکن گئے تو رشتے میں اپنے چچا اور صوبے کے میر عدل مولوی محی الدین خاں کے مشورے سے اورنگ آباد میں سکونت اختیار کرلی۔ اپنے والد مرحوم کے حالات بیان کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

> ۱۹۰۰ میں والد مرحوم نے مولوی محی الدین خاں صاحب سے بیعت کرلی اور ذکر و شغل، ریاضت و مجاہدات اور سلوک و مراقبہ میں لگ گئے۔ مگر ۱۹۰۴ء میں، جب کہ میں ایک سال کا تھا، انھوں نے نہ صرف وکالت بلکہ دنیا کمانے کی فکر ہی کو خیر باد کہہ دیا، بلکہ تمام اثاث البیت تقسیم کرکے دہلی تشریف لے گئے اور درگاہِ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے قریب ایک قدیم بستی 'عرب سرائے' میں اقامت گزیں ہوگئے اور اپنا سارا وقت دینی مشاغل میں صرف کرنے لگے۔ جب تین سال اسی طرح زندگی بسر کرتے گزر گئے تو مولوی محی الدین خاں صاحب نے ان کو پھر اورنگ آباد طلب کیا اور نصیحت کی کہ رجوع الی اللہ کے لیے ترکِ دنیا لازم نہیں۔ اس نصیحت پر عمل کرکے والد مرحوم نے پھر وکالت شروع کی، مگر اب رنگ یہ تھا کہ کوئی جھوٹا مقدمہ نہیں لیتے تھے۔ ہر مؤکل کو سب سے پہلے خود ان کی تحقیقات اور جرح و تنقید کے مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا۔ جب انھیں کامل اعتماد و اطمینان ہوجاتا کہ اس کا معاملہ سچا ہے، تب کہیں اس کی وکالت کرنے پر راضی ہوتے۔ ان تصورات کے ساتھ وکالت کا چلنا معلوم۔ رفتہ رفتہ اہلِ معاملہ کا رجوع ان کی طرف کم ہوتا چلا گیا اور مالی مشکلات بڑھتی گئیں، مگر اس کے ساتھ ان کا مذہبی رنگ اور زیادہ گہرا ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ان کی ذہنیت، ان کے خیالات، ان کی معاشرت، غرض ہر چیز اس قدر بدل گئی کہ یہ شبہ تک کرنے کی گنجائش نہ رہی کہ ان کو انگریزی تعلیم اور انگریزی خیالات کی ہوا بھی لگی ہے۔(۱)

سید احمد حسن صاحب 1915 تک اورنگ آباد میں وکالت کرتے رہے۔ پھر حیدر آباد تشریف لے گئے۔ مگر چند مہینے تک وہاں قیام کرکے خرابیِ صحت کے باعث بھوپال چلے گئے، جہاں مولانا مودودی کے بڑے بھائی سید ابومحمد مودودی میونسپل بورڈ کے ایگزیکٹو افسر تھے۔

(۱) مولانا مودودیؒ اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۲۸، ۲۹

بھوپال ہی میں ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ چار سال تک اسی مرض میں مبتلا رہ کر ۱۹۲۰ میں انتقال فرما گئے۔

سید احمد حسن رات کو سونے سے پہلے اپنے دونوں بچوں (ابوالخیر مودودی اور ابوالاعلیٰ مودودی) کو پیغمبروں کے قصے، تاریخِ اسلام، تاریخِ ہندستان اور سبق آموز کہانیاں سناتے تھے۔ وہ رسمی تعلیم و تلقین سے زیادہ حقیقی شعور و ادراک کے دل دادہ تھے۔ وہ مولانا الطاف حسین حالی کے شاگرد تھے اور ان سے گہری وابستگی بھی تھی۔ انھوں نے بچوں کی اردو تعلیم کے لیے حالی کے 'شکوۂ ہند' کو منتخب کیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا پرچہ الہلال ان کے یہاں باقاعدگی سے آتا تھا۔ وہ خود بھی اسے پابندی سے پڑھتے اور بچوں سے بھی پڑھوا کر سنتے تھے۔

سید احمد حسن صاحب زبان کے معاملے میں انتہائی محتاط تھے۔ ۲۰ برس تک حیدر آباد دکن میں مقیم رہے۔ لیکن انھوں نے اپنی زبان کو دکنی اثرات سے محفوظ رکھا۔ وہ اپنے بچوں کو عام بچوں کی صحبت سے دور رکھتے تھے۔ تاکہ ان کی زبان پر دکنی زبان کا اثر نہ پڑ جائے۔ اگر کبھی بچوں کی زبان سے کوئی مقامی لفظ، روزمرہ یا محاورہ سن لیتے تو بروقت اس کی اصلاح کر دیتے تھے۔

سید احمد حسن کی دوسری شادی رقیہ بیگم[۱] سے ہوئی تھی، جو مرزا قربان علی بیگ سالک[۲] کی صاحب زادی تھیں اور یہی ابوالخیر اور ابوالاعلیٰ کی والدہ تھیں۔ رقیہ بیگم مولانا قاسم نانوتویؒ سے بیعت تھیں۔ صوم و صلوٰۃ کی پابند، سادہ دل، حیادار اور ہم درد و مخلص خاتون تھیں۔ فجر کے بعد کم از کم ایک پارہ قرآنِ پاک بہ آوازِ بلند روزانہ تلاوت کرتیں اور یہ سلسلہ تا عمر جاری رہا۔ چلّے کاٹنے کا بھی شوق تھا۔ اکثر وہ قرآن خوانی میں مشغول رہتیں۔ بے حد شگفتہ اور دہلی کی ٹکسالی زبان بولتی تھیں۔ ان کے فقروں کی بندش ایسی ہوتی کہ سننے والا بھی جھوم اٹھتا تھا۔ بستر علالت کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ ابوالاعلیٰ معالج کو گھر لے آئے اور اماں بی کو بتایا کہ حکیم شریف صاحب تشریف

---

(۱) سید احمد حسن صاحب کی پہلی اہلیہ امت الحبیب تھیں جن کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان سے تین اولادیں ہوئیں: (۱) عصمت خاتون (۲) ابومحمد (۳) ابوالقاسم۔

(۲) مرزا قربان علی بیگ سالکؔ معروف شاعر اور غالب کے شاگرد تھے۔ ترکی النسل اور ریاست حیدر آباد میں محکمہ تعلیمات میں مامور تھے۔ انھوں نے مخزن الفوائد کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا۔ یہ رسالہ حیدر آباد کے قدیم ترین علمی و ادبی رسالوں میں شمار ہوتا ہے۔

لائے ہیں۔ انھوں نے برجستہ جواب دیا: ''نہ بیٹا نہ، اب کسی شریف کی ضرورت ہے، نہ کسی بدمعاش کی، اب تو دم رخصت ہے۔'' مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی گفتگو میں شیرینی، مزاح اور چست فقروں کی چاشنی اپنی والدہ محترمہ سے وراثت میں پائی تھی۔

رقیہ بیگم فراغت وعسرت اور عشرت وکلفت ہر دو حالات میں قناعت اور کفایت شعاری اختیار کرتیں، ملازمین کے ساتھ مساویانہ سلوک کرتیں، کھانا پہلے ان میں تقسیم کرتیں، بعد میں خود کھاتیں۔ وہ غریب پرور اور فیاض خاتون تھیں۔ اخراجات کے لیے روپے آتے تو پہلے محلے والوں کی ضرورت کا خیال رکھتیں۔

بچپن

اپنے بچپن کے گھریلو ماحول کے متعلق مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے لکھا ہے:

> ''میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا، وہ ایک مذہبی ماحول تھا۔ والد مرحوم اور والدہ ماجدہ دونوں کی زندگی ایک ہی مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ ان کی اس تربیت اور عملی نمونے کا یہ اثر تھا کہ ابتدا ہی سے میرے دل ودماغ پر مذہب کے گہرے نقوش مرتسم ہوگئے۔(۱)''

۲۰ویں صدی کے نصف اول تک شرفا کے یہاں خاندان میں چار سال کی عمر میں بچوں کی رسم بسم اللہ کا دستور تھا۔ یہ دستور اس عہد کے متوسط مسلم گھرانوں کے دینی طرز احساس کی بھرپور نمایندگی کرتا ہے۔ اس دستور کے مطابق ابوالاعلیٰ کی رسم بسم اللہ بھی چار سال کی عمر میں خاندانی روایت کے مطابق ایک تقریب میں ہوئی۔ ابوالاعلیٰ نے استاد کی مدد کے بغیر بسم اللہ خود ہی پڑھا۔ اس طرح قرآن سے رشتہ بچپن ہی میں جڑ گیا۔

پانچ برس کی عمر میں انھیں قرآن کی تین آیات بامعنی یاد تھیں۔ روزے انھوں نے قبل از وقت ہی شروع کردیے تھے۔ ان کے پہلے روزے کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ ایک دن صبح اٹھے تو اعلان کردیا کہ میں نے روزہ رکھا ہے۔ سب نے اصرار کیا کہ افطار کرلو لیکن وہ نہ مانے اور یوں کسی پابندی اور ترغیب کے بغیر نماز روزے کے پابند ہوگئے۔

پانچ برس کی عمر کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ ایک دن ابوالاعلیٰ اپنے والد ماجد کے ہمراہ

---

(۱) مولانا مودودیؒ اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۲۹-۳۰۔

نماز پڑھنے مسجد گئے، تو معلوم ہوا کہ مؤذن کی عدم موجودگی میں اذان نہیں دی گئی ہے۔ چناں چہ آپ مکبر (اذان کی جگہ) پر چڑھ گئے اور بہ آوازِ بلند اذان دینا شروع کر دی۔ والد پریشان ہو رہے تھے کہ انھوں نے آپ کو ابھی اذان نہیں سکھائی تھی لیکن جب آپ نے اذان مکمل کر لی تو نمازیوں نے ڈھیروں پیار کیا اور دعائیں دیں۔ وقت کے صحراؤں میں اذان پکارنے والے کی یہ پہلی صدا تھی۔

ان کے بچپن کا ایک اور دل چسپ واقعہ یہ ہے کہ ایک بار اشفاق احمد صاحب[1] نے ابوالاعلیٰ سے فرمایش کی کہ بتاؤ، غالب کے اس شعر کا کیا مفہوم ہے:

ضعف سے گریہ مبدّل بہ دم سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

اسی وقت گلی میں قلفی والے نے آواز لگائی۔ ابوالاعلیٰ نے مطالبہ کیا کہ پہلے قلفیاں کھلائی جائیں، تب بتاؤں گا۔ وعدہ کر لیا گیا کہ جتنی قلفیاں کہو گے، کھلا دی جائیں گی، شعر کا مفہوم بتاؤ۔ ابوالاعلیٰ نے شعر کی تشریح اس طرح کی ''ضعف کی وجہ سے جو سرد آہیں بھر رہا ہوں اور رو نہیں رہا، تو اس کا سبب یہ ہے کہ آنسو خشک ہو کر ہوا ہو گئے ہیں اور آہوں کی صورت میں نکل رہے ہیں۔'' شعر کی معقول تشریح سن کر اشفاق صاحب پھڑک اٹھے۔ قلفیاں حاضر کی گئیں اور انھوں نے آٹھ قلفیاں کھائیں۔

سید احمد حسن کے خاندان میں دو ہی بچے تھے۔ ابوالخیر مودودی اور ابوالاعلیٰ مودودی۔ ابوالاعلیٰ ان میں چھوٹے تھے، اس لیے والدین بھی ان کی خوب ناز برداری کرتے۔ دوسرے یہ کہ ان کی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے انھیں گھر میں خصوصی مقام حاصل تھا۔ وہ ۱۰ برس کی عمر تک والد صاحب کے ساتھ سوتے تھے اور والد صاحب ان کے بغیر بے قرار رہتے۔

ان کے والد کی تربیت کا ایک خاص انداز تھا، مثلاً ایک بار ابوالاعلیٰ نے گھریلو ملازمہ کے بچے کی پٹائی کر دی۔ ملازمہ بچے کو لے کر والد صاحب کے پاس انصاف کے لیے آئیں۔

---

(۱) اشفاق احمد صاحب، سید احمد حسن صاحب کے ایک قریبی عزیز تھے۔ انھیں مضمون نویسی اور کتب بینی کا نہایت شوق تھا۔ انھوں نے فراست الید لکھی ہے۔ مذکورہ واقعہ ان دنوں کا ہے جب موصوف احمد حسن کے یہاں بہ طور مہمان قیام پذیر تھے۔

والد صاحب نے ابوالاعلیٰ کو ملازمہ کے بچے کے سامنے پیش کر دیا اور کہا: ''تو بھی اسے مار۔'' اس طرح گویا انھیں سکھایا گیا کہ کسی پر ظلم وستم اور زیادتی کرنا روا نہیں ہے۔

سید احمد حسن، ابوالخیر مودودی کو ''خیرو' اور ابوالاعلیٰ مودودی کو 'منا' کہا کرتے تھے۔ والد صاحب اور خیرو کے علاوہ بچپن میں 'منا' کا کوئی دوست نہ تھا۔ اس لیے ان کی زبان بیرونی اثرات سے محفوظ رہی اور تصنع اور دروغ گوئی سے آشنا نہیں ہوسکی۔ ان کے والد صاحب انھیں اپنے دوستوں کی مجلس میں بھی لے جاتے تھے، جو نہایت سنجیدہ وشایستہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہوتے تھے۔ ان صحبتوں کے فیض نے ابوالاعلیٰ کی فطری شوخی وشرارت کو سنجیدہ ظرافت میں تبدیل کر دیا۔

تعلیم

ابوالاعلیٰ نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اردو میں مولانا حالی کی شکوۂ ہند اور مدو جزر اسلام (مسدس حالی)، فارسی میں گلستان اور بوستان اور عربی زبان میں صرف ونحو اور فقہ وحدیث کی کتابیں گھر ہی پر پڑھیں۔ والد گرامی انھیں دینی تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے تھے، اس لیے انگریزی اور دیگر علوم کی تعلیم کے لیے اسکول میں داخل نہ کرایا۔ ۹ برس تک گھر ہی میں تعلیم حاصل کی۔ اس کا سبب بتاتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں کہ غالباً میری زبان کی حفاظت کے لیے اور مجھے بری صحبتوں سے بچانے کے لیے والد گرامی مجھے کسی مدرسے میں بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ ۱۱ برس کی عمر میں مولوی ندیم اللہ حسینی مرحوم کے مشورے سے ان کا داخلہ مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد کی جماعت رشدیہ (آٹھویں جماعت) میں کرایا گیا۔ ابوالاعلیٰ داخلے کے چند ماہ بعد رشدیہ کے امتحان میں شریک ہوئے، مگر ناکام ہوئے۔ ناکامی کی وجہ بتاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے ریاضی سے کوئی دل چسپی نہ تھی اور ریاضی کی تعلیم بھی میں نے صرف اسی چھ مہینے کی مدت میں حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ کسی اور مضمون میں میں کم زور نہ تھا، اس وجہ سے صدر مدرس ملا داؤد صاحب نے جو ابتدا سے مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے، میری ناکامی کے باوجود، مجھے جماعت مولوی میں شریک کرلیا۔[۱]

۱۹۱۴ میں انھوں نے مولوی کا امتحان ریاضی میں کم زور ہونے کی وجہ سے درجۂ دوم (Second class) میں پاس کیا۔[۲] اس زمانے میں ان کے والد گرامی کی مالی مشکلات بہت زیادہ

---

(۱) مولانا مودودیؒ اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۳۱۔
(۲) ایضاً۔

بڑھ گئی تھیں اور صحت بھی خراب ہوگئی تھی، لٰہٰذا وہ اورنگ آباد چھوڑ کر حیدر آباد تشریف لے گئے اور ابو الاعلیٰ کا داخلہ دار العلوم کی جماعت مولوی عالم (انٹرمیڈیٹ سال اول) میں کرادیا۔ اس زمانے میں علامہ حمید الدین فراہی مرحوم دار العلوم کے صدر مدرس (پرنسپل) تھے۔ مگر یہاں بھی تعلیم کا سلسلہ چھے ماہ سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ اس کے بعد ابو الاعلیٰ اپنے والد صاحب کے علاج کے لیے بھوپال چلے گئے، نتیجتاً تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

قیام دہلی کے دوران انھوں نے ایک استاد مولوی محمد فاضل صاحب سے انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کا یہ سلسلہ بھی چار پانچ ماہ سے زیادہ نہ رہا۔ اس دوران انھوں نے اتنی استعداد پیدا کرلی کہ انگریزی میں اخبارات، رسائل اور کتب کا مطالعہ ازخود کرنے لگے۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ تاریخ، فلسفہ، سیاسیات، معاشیات، مذہبیات اور عمرانیات کی مشکل کتابیں پڑھنے اور سمجھنے پر بھی قادر ہوگئے۔ اس کے بعد انھوں نے دار العلوم فتح پوری دہلی میں داخلہ لیا اور باقاعدہ تکمیل درس کی سند حاصل کی۔ اسی زمانے میں انھوں نے مشہور عالم دین مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی سے حدیث، فقہ اور ادب میں سندِ فراغت وتدریس حاصل کی۔ جامع ترمذی اور موَطا امام مالک کی سمع وقراءت کی تکمیل بھی انھی سے کی اور مولانا شریف اللہ صاحب سے دوعلوم ''عقلیہ وادبیہ و بلاغت'' اور ''علوم اصلیّہ وفروعیّہ'' میں سندِ فراغت حاصل کی۔

قیام دہلی (۱۹۲۸) کے دوران ہی ابو الاعلیٰ نے نحو، معقولات اور معانی و بلاغت کی تعلیم خیرآبادی خاندان کے علمی وارث مولانا عبد السلام نیازی سے حاصل کی۔ اپنے تجرِ علمی اور درویشی کی وجہ سے مولانا نیازی علماے سلف کی یادگار تھے۔ مولانا نیازی کم ہی لوگوں کو پڑھاتے تھے اور صرف انھی کو اپنی شاگردی میں قبول کرتے تھے جنھیں علم حاصل کرنے کا واقعی ذوق وشوق ہوتا تھا۔ ابو الاعلیٰ علی الصبح مولانا نیازی صاحب کے یہاں جاتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ استاد کا مزاج اجازت نہ دیتا، وہ معذرت کر دیتے اور ابو الاعلیٰ خاموشی کے ساتھ واپس ہوجاتے۔

صحافت

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے (۱۹۱۸ میں) ۱۵ برس کی عمر میں اخبار نویسی کے میدان میں قدم رکھا۔ ابتدا میں انھوں نے اپنے بڑے بھائی ابو الخیر مودودی کے ساتھ اخبار مدینہ (بجنور)

میں معاون مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ ان کی یہ ابتدائی مصروفیت ڈیڑھ دو ماہ سے زیادہ نہ چل سکی اور وہ واپس دہلی چلے گئے۔ وہاں اس دور کی سیاسی فضا سے متاثر ہوئے اور 'انجمن اعانت نظر بندانِ اسلام' میں کارکن کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا اور ۱۹۱۹ میں مولانا محمد علی جوہر کی تحریک خلافت اور ستیہ گرہ میں بھی حصہ لیا۔ اسی زمانے میں انھوں نے گاندھی جی کے حوالے سے چند صفحوں پر مشتمل پمفلٹ لکھا، جو طبع ہونے سے پہلے ضبط کرلیا گیا۔

'انجمن اعانتِ نظر بندان اسلام' کے روحِ رواں تاج الدین صاحب نے ۱۹۱۹ میں جبل پور سے ہفتہ وار تاج نکالا اور اس کی ادارت دونوں بھائیوں ابوالاعلیٰ اور ابوالخیر کے سپرد کی لیکن یہ اخبار بھی چھے ماہ سے زیادہ نہ نکل سکا اور پھر دونوں بھائی جبل پور سے بھوپال اور پھر دہلی واپس چلے گئے۔

۱۹۲۰ میں والد گرامی کے انتقال کے بعد ابوالخیر مودودی نے اخبار نویسی کو ترک کردیا، جب کہ ابوالاعلیٰ مودودی عملی صحافت سے وابستہ رہے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ۱۹۲۰ میں تاج الدین صاحب نے جبل پور سے تاج کا دوبارہ اجرا کیا اور ابوالاعلیٰ کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ مگر اس پر بہ طور ایڈیٹر تاج الدین کا نام ہی چھپتا تھا۔ یہ اخبار بیش تر ہم عصر اخباروں کی طرح انگریز مخالف تھا۔ ایک مضمون پر حکومت نے سخت گرفت کی، چوں کہ اخبار کے ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر کی حیثیت سے تاج الدین صاحب کا نام شائع ہوتا تھا، اس لیے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ گو اس طرح ابوالاعلیٰ حکومت کی گرفت سے بچ گئے، لیکن انھیں اس سے بچنے کی کوئی خوشی نہ ہوئی اور تہیہ کیا کہ آیندہ کے لیے اپنی ہر جنبشِ قلم کی ذمہ داری خود اپنے سر لیں گے۔ اس واقعے کے بعد ابوالاعلیٰ مودودی دہلی واپس چلے گئے۔ ۱۹۲۱ میں جمعیت علمائے ہند کی طرف سے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کے زیرِ اہتمام اخبار مسلم جاری ہوا اور اس کی ادارت ابوالاعلیٰ کے سپرد کی گئی۔ لیکن یہ اخبار بھی ۱۹۲۳ میں بند ہوگیا۔

۱۹۲۵ء میں جمعیت علمائے ہند کے صدر احمد سعید نے الجمعیت جاری کیا اور قدیم تعلقات کی بنا پر انھوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو اس کا ایڈیٹر بنایا۔ انھوں نے ۱۹۲۸ کے خاتمے تک اس کی ادارت کی اور پھر اس سے قطعِ تعلق کرلیا۔ ادارہ عالم گیر تحریک قرآن کی طرف سے ماہ نامہ ترجمان القرآن ۱۳۵۱ھ بہ مطابق ۱۹۳۲ میں حیدرآباد دکن سے مولانا ابومحمد مصلح صاحب

نے جاری کیا۔ یہ رسالہ چھے شماروں تک مولانا موصوف کی ادارت میں نکلتا رہا۔ اس کے بعد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس رسالے کو خرید لیا اور تادم حیات اس کی ادارت کرتے رہے۔ مدینہ، تاج، مسلم، الجمعیت اور ترجمان القرآن کی ادارت کے علاوہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اس دور کے دیگر مؤقر جریدوں اور رسالوں میں بھی مضامین اور مقالے شائع کرواتے رہے۔ ان میں صدق، رہبر، طلوع اسلام، معارف، نگار، ہمایوں، مخزن اور ساقی وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان کا پہلا مضمون ''برق یا کہربا'' 1918 میں معارف، اعظم گڑھ، کے شمارہ اکتوبر میں شائع ہوا تھا۔

ابتدائی ادبی مشق

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ادبی تربیت ایک حد تک بچپن ہی میں ہو چکی تھی۔ جس ماحول میں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی، وہ علمی و دینی ہونے کے ساتھ ادبی ذوق کا بھی حامل تھا۔ ان کے بڑے بھائی ابوالخیر مودودی ایک بڑے صحافی و مترجم، ماہر زبان اور بلند پایہ ادیب تھے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنے اہم مسودات نظر ثانی کے لیے انھیں دیتے تھے۔ ان کے والد محترم بڑے پایے کے عالم، چوٹی کے وکیل اور اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے تھے۔ حالؔی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے حالی کی شاعری اور الہلال اور البلاغ کی نثر سے عصری شعور و آگہی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مشہور عالم دین مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے باضابطہ درس حدیث لیا تھا۔ صحاح ستہ اور قرآن مجید کے اردو مترجم مولانا وحید الزماں اپنے ترجمے ان کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ خود انھوں نے ان کے ساتھ صحاح ستہ کا سات مرتبہ دور کیا تھا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نانا مرزا قربان علی بیگ خان سالکؔ شاعر اور صوفی تھے اور اسد اللہ غالبؔ کے شاگردِ رشید تھے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بچپن ہی میں عربی و فارسی اور اردو زبان و ادب میں مستعمل ضرب الامثال اور محاوروں سے واقفیت حاصل کر لی تھی اور مسدس حالی، شکوۂ ہند، الہلال، البلاغ، گلستان اور بوستان کے طرز انشا سے متعارف ہو چکے تھے۔ انھوں نے مضمون نگاری کی ابتدا ۹ برس کی عمر میں کر دی تھی۔ اپنی اس ابتدائی تحریر کے بارے میں انھوں نے خود نوشت حالات میں لکھا ہے:

> تحریر و انشا کی طرف میرے فطری میلان کا اظہار سب سے پہلے اس وقت ہوا جب میں ۹ برس کا تھا۔ اس زمانے میں میرے قریبی عزیز جناب اشفاق احمد زاہدی

(صاحب فراست الید) جن کو مضمون نویسی اور کتب بینی کا شوق تھا، اورنگ آباد آئے اور کچھ مدت کے لیے ہمارے ہاں ٹھہرے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ہماری صلاحیت کا امتحان لینے کے لیے کہا کہ اپنے خیال میں یہ سمجھ لو کہ کسی لڑکی پر عاشق ہوگئے ہو اور اپنی اس خیالی معشوق کو خط لکھو، جس میں محبت کے جذبات اور ہجر کی تکالیف کا اظہار ہو۔ یہ ایک ایسا مضمون تھا جس سے ہم بالکل نابلد تھے اور کم از کم میری عمر تو ایسی تھی کہ میرے ذہن میں عشق اور معشوق اور محبت و ہجر کے تصور کی گنجایش ہی نہ تھی، مگر اس زمانے میں گلستان، بوستان پڑھ چکا تھا۔ اس سے صرف اتنا معلوم ہوگیا تھا کہ عشق کوئی مرض ہے، جو کسی اچھی صورت کو دیکھ کر ہو جایا کرتا ہے اور اس مرض سے دل میں آگ لگ جایا کرتی ہے جو اس کے ملنے ہی سے بجھتی ہے اور جب تک وہ نہ ملے اس وقت تک غریب بیمار جلتا رہتا ہے اور اس حالت کا نام ہجر ہے۔ ان معلومات کو ہم نے اس وقت اپنی بساط کے مطابق خوب استعمال کیا اور ایک لمبا چوڑا خط ان کیفیات کے بیان میں لکھ کر پیش کر دیا۔ اب ہم دونوں میں سے کسی کو یاد نہیں اور نہ بھائی اشفاق کو یاد ہے کہ ہم نے اس وقت کیا لکھا تھا مگر یہ ضرور یاد ہے کہ وہ ان خطوں کو دیکھ کر پھڑک گئے تھے اور خصوصیت کے ساتھ میرے خط کو انھوں نے زیادہ پسند کیا تھا۔[۱]

قدرت نے مولانا مودودیؒ کو تحریر وانشا کا غیر معمولی ملکہ عطا فرمایا تھا۔ اس مختصر آزمایشی مضمون کے بعد ان کے قلم نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور ان کی تحریروں نے پھر ایسے چراغ روشن کیے، جو آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ کہے جاسکتے ہیں۔ ۱۹۱۴ میں جب کہ ان کی عمر مشکل سے ۱۱ برس تھی، اپنے بڑے بھائی کی تحریک پر انھوں نے قاسم امین بے کی عربی کتاب **المرأة الجدیدة** کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کا مسودہ بد قسمتی سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

اس ترجمے کی روانی، سلاستِ زبان اور چٹخارے دار محاورے دیکھ کر والد مرحوم بہت خوش ہوئے تھے اور بھائی نے خوب داد دی تھی۔[۲]

صحافتی زندگی کے دوران میں انھوں نے کئی کتابیں ترجمہ وتصنیف کیں۔ تحریک

---

(۱) مولانا مودودیؒ اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۲۷

(۲) ایضاً، ص ۳۸

خلافت کے خاتمے پر سمرنا میں یونانی مظالم اور مسئلہ خلافت (۱۹۲۲)، ترکی میں عیسائیوں کی حالت (۱۹۲۴) اور اخلاقیات اجتماعیہ[1] (۱۹۲۴) لکھی جو دہلی سے شائع ہوئی۔ الجمعیت کی ادارت کے دوران اسلام کا سر چشمۂ قوت (۱۹۲۵) الجہاد فی الاسلام[2] (۱۹۲۸) اور دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ (۱۹۲۸) کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔

قیامِ حیدر آباد (۱۹۳۰-۱۹۳۲) کے زمانے میں انھوں نے تاریخ آل سلجوق تالیف کی اور ابن خلکان کے ان حصوں کا ترجمہ کیا جو مصر کے فاطمی خلفا سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے نظام الملک آصف جاہ، اوّل کی سیرت لکھی اور مختصر تاریخ دکن مرتب کی۔

۱۹۳۲ میں جامعہ عثمانیہ کے لیے ملا صدر الدین شیرازی کی عربی فلسفے کی ایک بہت مشکل کتاب **اسفار اربعہ** کے ایک حصے کا ترجمہ کیا، مگر شائع نہ ہوسکا۔ اس کے علاوہ دو اور مضامین لکھے، ان میں سے پہلا 'مونٹی کارلو کا جوئے خانہ' جو روزنامہ جسارت کراچی میں ۱۹۸۲ میں شائع ہو چکا ہے۔ اور دوسرا ٹیگور کی ''گیتا نجلی'' کا اردو ترجمہ اب نایاب ہے اور باوجود تلاش و جستجو کے حاصل نہیں ہوسکا۔ مذکورہ بالا تصانیف و تراجم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ابتدائی کاوشیں تھیں، جن کے متعلق ان کا خیال تھا:

> یہ میری ابتدائی مشق تھی...اور عام مطالعے کے ساتھ انشا پردازی کا شوق ایسا دامن گیر ہوا کہ اب شاید مرنے سے پہلے پیچھا نہ چھوڑے گا۔ ابتدائی تین چار سال تک نومشقی کی حالت کی تھی، جس کا اندازِ تحریر پسند آجاتا تھا، اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا تھا، مگر جوں جوں مطالعہ بڑھتا گیا، میں یہ محسوس کرتا گیا کہ تحریر کی اصل خوبی دوسروں کے انداز میں لکھنا نہیں ہے، بلکہ خود اپنے انداز میں لکھنا ہے۔ ۱۹۲۱ سے خود اپنا مستقل رنگ اختیار کیا ہے جس میں، میں کسی کا مقلد نہیں ہوں۔[3]

---

(۱) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے رسالہ ہمایوں لاہور میں اس عنوان سے یکے بعد دیگرے ۱۰ قسطوں میں مضامین لکھے۔

(۲) الجمعیت کے ادارتی کالموں میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلامی اصول جنگ کے بارے میں لکھنا شروع کیا۔ ابتدا میں قسط وار ایک مقالہ لکھنے کا ارادہ تھا، مگر سلسلۂ کلام اس قدر پھیلا کہ اخبار کے کالموں میں اس کا سمانا ممکن نہ رہا۔ اس لیے ۲۳، ۲۴ اقساط شائع کرنے کے بعد اس کی اشاعت روک دی گئی۔ ۱۹۳۰ء میں کتاب کی صورت میں اس کی پہلی اشاعت دار المصنفین اعظم گڑھ سے ہوئی۔ اس کے بارے میں علامہ اقبال کی رائے تھی: اسلام کے نظریۂ جہاد اور اس کے قانون صلح و جنگ پر الجہاد فی الاسلام ایک بہترین تصنیف ہے، اور میں ہر ذی علم آدمی کو مشورہ دیتا ہوں کہ اس کا مطالعہ کرے۔

(۳) مولانا مودودیؒ اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۲۷۔

تحریکی سرگرمیاں

گورداس پور، پٹھان کوٹ کے ایک مخلص مسلم لیگی مسلمان چودھری نیاز علی خاں نے اپنی ۱۶۰ ایکڑ اراضی میں ایک مسجد، چند عمارات اور ایک دارالاقامہ بنوایا تھا، وہ اس جگہ کو خدمت دین کے لیے وقف کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں پہلے انھوں نے علامہ اقبال سے مشاورت کی۔ علامہ اقبال نے انھیں بتایا:

حیدر آباد سے ایک بڑا اچھا رسالہ ترجمان القرآن نکل رہا ہے۔ ابو الاعلیٰ مودودی صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں۔ میں نے ان کے مضامین پڑھے ہیں۔ دین کے ساتھ ساتھ وہ مسائلِ حاضرہ پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب الجہاد فی الاسلام مجھے بہت پسند آئی ہے۔ آپ کیوں نہ انھیں دارالاسلام آنے کی دعوت دیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ دعوت قبول کرلیں گے۔(۱)

چودھری نیاز علی خاں صاحب نے سید ابو الاعلیٰ مودودی سے رابطہ قائم کر کے مشورہ طلب کیا کہ کس قسم کا ادارہ قائم کیا جانا چاہیے۔ اس کے جواب میں مولانا مودودی نے دارالاسلام کے لیے ایک خاکہ تیار کر کے بھیج دیا۔ بعد میں چودھری صاحب نے علامہ اقبال سے حتمی مشورہ کیا اور پھر علامہ اقبال نے مولانا مودودی کو ۱۹۳۶ کے آخر میں پنجاب آنے کی دعوت دی۔ ابتدا میں انھوں نے معذرت کرلی تھی کیوں کہ حیدر آباد میں اسی طرح کا ادارہ قائم کرنے کے لیے انھوں نے زمین لے رکھی تھی، لیکن جنوبی ہند کی سرزمین شاید دعوتِ اسلامی کے لیے اتنی زرخیز نہیں تھی۔ بعد میں چودھری صاحب کے اصرار پر اواخر اگست ۱۹۳۷ میں انھوں نے پنجاب کا سفر کیا۔ اسی دوران میں علامہ اقبال سے بھی ملاقات ہوئی اور انھوں نے دعوت و تبلیغِ دین کے لیے دارالاسلام، پٹھان کوٹ کا انتخاب کرلیا(۲) مگر اس ساری داستان کا المیہ یہ ہے کہ مارچ ۱۹۳۸ کے آخر میں مولانا مودودی پٹھان کوٹ منتقل ہوئے اور اپریل میں علامہ اقبال کا انتقال ہوگیا۔

---

(۱) سید مودودی کا عہد، سید نقی علی، ص ۳۵۔

(۲) سید مودودی فرماتے ہیں: علامہ اقبال صاحب نے مجھے پٹھان کوٹ میں آنے کو لکھا تھا اور مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ ''اگر تم اس جگہ آکر بیٹھ جاؤ تو میں بھی سال میں چھے مہینے وہاں گزارا کروں گا۔'' اس میں ایک ایسی جاذبیت تھی، جس کی وجہ سے میں نے اس تجویز کو فوراً قبول کرلیا اور حیدر آباد سے پٹھان کوٹ چلا آیا۔ (اقبال اور مودودی: ابو راشد فاروقی، ص ۶۰)

دارالاسلام پٹھان کوٹ میں مولانا مودودی کا ابتدائی قیام فروری ۱۹۳۹ تک رہا۔اس دوران میں انھوں نے ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش'' کے سلسلے کے زوردار علمی و سیاسی مضامین لکھ کر کانگرس پر تنقید کی اور مسلم لیگ، خاک سار، احرار اور جمعیت علما سبھی کو اسلام کے اصل نصب العین کی طرف آنے کی دعوت دی۔ چودھری نیاز علی خاں صاحب سیاسی لحاظ سے مسلم لیگی تھے۔ انھوں نے صاف کہہ دیا کہ اگر آپ یہاں رہیں گے تو مسلم لیگ کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھیں گے(۱) لہٰذا مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے پٹھان کوٹ کو خیر باد کہنا ہی مناسب سمجھا اور لاہور آ کر اسلامیہ پارک میں مقیم ہو گئے۔ چودھری صاحب نے ۱۹۴۲ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو دوبارہ پٹھان کوٹ آنے کی دعوت دی اور اصرار کیا۔ چناں چہ ۱۵/جون ۱۹۴۲ کو مولانا اپنے رفقائے کار کے ساتھ دوبارہ دارالاسلام منتقل ہو گئے اور تقسیم ہند تک یہیں سے تبلیغ و اشاعتِ دین کا کام کرتے رہے۔

تدریس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے قیام لاہور کے دوران میں اسلامیہ کالج لاہور کے دینیات کے پروفیسر مولانا محمد عمر صاحب اپنی ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ کالج کے ارباب حل وعقد کو دینیات کے پروفیسر کی تلاش ہوئی اور ان کی نگاہِ انتخاب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی پر آ کر ٹھہری۔ انتظامیہ نے مولانا مودودی سے اس کو قبول کرنے کی درخواست کی، انھوں نے اس ذمے داری کو اعزازی طور پر منظور کر لیا(۲) آپ اسلامیہ کالج تانگے پر سوار ہو کر جاتے تھے اس لیے انجمن سے فقط ماہانہ پچاس روپے تانگے کا خرچ لیتے تھے۔ کالج میں ان کا تقرر ہونے سے دینیات کے مضمون میں نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ ان کی کلاس میں طلبہ کے ساتھ اساتذہ بھی شریک ہوتے تھے۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے دروس میں ایک داعیہ تھا۔ چناں چہ ان دروس نے طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ کو بھی متاثر کیا اور کالج کی فضا بدلنے لگی(۳) لیکن یہ سلسلہ فقط ایک برس تک

---

(۱) سید ابوالاعلیٰ مودودی، سوانح، افکار، تحریک، مرتب: ابوآفاق، ایم اے، ص ۱۷۵۔

(۲) اسلامیہ کالج کی پروفیسری سے قبل قیام حیدر آباد کے دوران ابوالاعلیٰ مودودی کو جامعہ عثمانیہ کی طرف سے دو ہزار روپے ماہوار پر اسلامیات کی پروفیسر کی پیش کش ہوئی تھی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے وزیر اعظم ریاست سر اکبر حیدری سے بات کرنے کے بعد ان سے بہت اصرار کیا تھا، مگر انھوں نے معذرت کر دی تھی۔

(۳) اقبال اور مودودی کا تقابلی مطالعہ، عمر حیات خان غوری، ص ۱۴۹، ۱۵۰۔

ہی جاری رہ سکا۔ ان کے دروس کے اثرات سے انگریزی حکومت کو خطرہ محسوس ہونے لگا، بالآخر انگریزی حکومت کے اشارے پر پنجاب کے وزیر اعظم سکندر حیات نے انتظامیہ کو ہدایت کی کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو کالج سے الگ کر دیا جائے، چناں چہ آپ اسلامیہ کالج سے علیحدہ ہو گئے۔

تشکیل جماعت

دنیا کو پیش آمدہ ظلمت سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لیے مولانا مودودی اور ان کے ہم خیال رفقا نے صحیح اسلامی اصولوں پر کاربند ایک صالح جماعت کی ضرورت محسوس کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے ترجمان القرآن (اپریل ۱۹۴۱) میں ''ایک صالح جماعت کی ضرورت'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا اور ملک کے دانش وروں اور علماے کرام کو موجودہ فاسد نظام تہذیب وتمدن اور کافرانہ سیاست کے خلاف بغاوت کرنے کی دعوت دی۔ ان کی اس دعوت پر ۷۵ افراد کا ایک اجلاس ۲۵ /اگست ۱۹۴۱ کو لاہور کے اسلامیہ پارک میں منعقد ہوا اور ۲۶ /اگست ۱۹۴۱ کو باہمی مشورے سے جماعت اسلامی کی تشکیل عمل میں آئی۔ اس اجتماع میں اتفاق رائے سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو جماعت کا امیر منتخب کیا گیا۔ جماعت کا دستور مرتب کیا گیا اور اجتماعی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ ۱۵ /جون ۱۹۴۲ کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی دار الاسلام پٹھان کوٹ منتقل ہوئے۔ بعد ازاں امیر جماعت سے اختلاف کی بنا پر مولانا منظور نعمانی، مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی، قمر الدین خان اور عطاء اللہ صاحب نے جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ بایں ہمہ جماعت نے ایک عزم اور منصوبے کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھا۔ کام آگے بڑھاتے ہوئے جماعت اسلامی نے دربھنگا (اکتوبر ۱۹۴۳)، دہلی (اپریل ۱۹۴۴) اور دار الاسلام پٹھان کوٹ (مارچ ۱۹۴۴) میں علاقہ وار چار بڑے بڑے اجتماعات منعقد کیے۔ اپریل ۱۹۴۵ میں پہلا کل ہند اجتماع دار الاسلام پٹھان کوٹ میں ہوا، جس میں ارکان کی تعداد ۸۰۰ تھی۔

دار و رسن

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی متحدہ قومیت کے سخت خلاف تھے اور جداگانہ مسلم تشخص کی حمایت کر رہے تھے۔ مسلم لیگ جداگانہ قومیت کی اساس پر قائم ہوئی تھی۔ مسلم لیگ کو تحریک

پاکستان کے سلسلے میں مولانا مودودی کی تحریروں سے بہت مدد ملی۔ تقسیم ہند کے ساتھ ہی پاکستان ایک علیحدہ ریاست کے طور پر وجود میں آیا۔ اگست ۱۹۴۷ میں مولانا مودودی کو اپنے رفقا سمیت پٹھان کوٹ چھوڑ کر لاہور آنا پڑا۔ اب مسلم لیگ کے لیے اپنے وعدوں کے مطابق پاکستان میں اسلامی دستور نافذ کرنا ضروری تھا، مگر اپنے وعدوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے اربابِ حکومت اسلامی دستور کا نفاذ نہیں چاہتے تھے۔ اسلامی دستور کا مطالبہ کرنے والے حکومت کی نظر میں پاکستان دشمن سمجھے جانے لگے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی کو اس بات کی فکر تھی کہ اس نوزائیدہ مسلم حکومت کی بنیاد مغربی طرز کی جمہوریت پر قائم نہ ہو جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جنوری ۱۹۴۸ میں لاہور کے لا کالج میں تقریر کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ پاکستان کا دستور اسلامی اصولوں کے مطابق بنایا جائے۔ پھر اپریل ۱۹۴۸ میں کراچی کے جہانگیر پارک میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے ایک چار نکاتی مطالبہ[۱] پیش کیا، جس کے بارے میں انھوں نے کہا تھا کہ دستور ساز اسمبلی اسے منظور کر لے تو گویا اس نے کلمہ پڑھ لیا۔ جماعت اسلامی اور پاکستانی عوام نے اس چار نکاتی مطالبے کو مختلف ذرائع سے دستور ساز اسمبلی کو ارسال کیا۔ ردِ عمل کے طور پر حکومت نے مولانا کے خلاف زبردست پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ اس نے اس عوامی مہم کا زور توڑنے کی انتہائی کوششیں کیں مگر سخت ناکام ہوئی۔ آخر کار دستور اسلامی کے مطالبے کو ایک فتنہ قرار دیتے ہوئے مولانا مودودی اور ان کے احباب کو ۴ر اکتوبر ۱۹۴۸ کو گرفتار کر لیا گیا۔ ابتدا میں انھیں سیفٹی ایکٹ کے تحت صرف چھے ماہ کے لیے نظر بندی کی سزا سنائی گئی لیکن بعد میں، اس میں چھے چھے ماہ کا اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۰ تک جاری رہا۔

---

(۱) وہ چار نکاتی مطالبہ یہ تھا:

(۱) پاکستان کی بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، اور حکومت پاکستان کی کوئی حیثیت اس کے سوا نہیں کہ وہ اپنے بادشاہ کی مرضی اس ملک میں پوری کرے۔

(۲) تمام وہ قوانین جو اسلامی شریعت کے خلاف اب تک جاری رہے، منسوخ کیے جائیں اور آیندہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کیا جائے، جو شریعت کے خلاف پڑتا ہو۔

(۳) پاکستان کا بنیادی قانون اسلامی شریعت ہو۔

(۴) حکومت پاکستان اپنے اختیارات ان حدود کے اندر استعمال کرے گی، جو شریعت نے مقرر کر دی ہیں۔

(سید مودودی: دعوت و تحریک، سید اسعد گیلانی، ص ۷۷ ۴)

اس دوران دستور اسلامی کی یہ مہم جاری رہی۔ بالآخر حکومت کو یہ مطالبہ تسلیم کرنا پڑا اور ۱۲/مارچ ۱۹۴۹ کو دستور ساز اسمبلی پاکستان نے قرار داد مقاصد پاس کی۔(۱) آخر کار ۲۰/مئی ۱۹۵۰ کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے احباب کو رہائی ملی۔

پاکستانی حکومت نے اسلامی دستور کے مطالبے کو منظوری تو دے دی تھی مگر حکومت کی جانب سے اس سلسلے میں کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی جا رہی تھی، اس لیے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے احباب نے ۱۹۵۲ کے آغاز میں دستور ساز اسمبلی کے لیے آٹھ نکاتی مطالبہ پیش کیا اور پورے ملک میں اسلامی دستور کی تیاری کے لیے مہم کا آغاز کر دیا۔ مگر اسی اثنا میں مجلسِ احرار نے ختم نبوت کی تحریک شروع کر دی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے فتنۂ قادیانیت کی اصلیت واضح کرنے کے لیے قادیانی مسئلہ لکھا۔ اسی دوران پنجاب میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا اور مارشل لا کے نفاذ کے باوجود قادیانی مسئلہ کی اشاعت جاری تھی۔ اس جرم کا بہانہ بنا کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور قادیانی مسئلہ کے پرنٹر اور پبلشر کو ۲۷، ۲۸/مارچ ۱۹۵۳ کی درمیانی شب میں گرفتار کر لیا گیا۔ ۷/مئی ۱۹۵۳ کو سنٹرل جیل لاہور میں ان لوگوں کے خلاف مقدمے کی سماعت شروع ہوئی اور مارشل لا عدالت نے ۱۱/مئی ۱۹۵۳ کو مولانا مودودی کو پھانسی کی سزا سنائی، ان سے کہا گیا کہ آپ کو اس فیصلے کے خلاف اپیل کا حق ہے، اس پر مولانا مودودی نے یہ پرعزیمت الفاظ کہے:

> مجھے کسی سے کوئی اپیل نہیں کرنی، زندگی اور موت کے فیصلے زمین پر نہیں، آسمان پر ہوتے ہیں۔ اگر وہاں میرے لیے موت کا فیصلہ ہو چکا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے موت سے نہیں بچا سکتی۔ بندہ رب کے فیصلے پر راضی ہے اور اگر وہاں میری موت کا فیصلہ نہیں ہوا تو دنیا کی کوئی طاقت میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔(۲)

سزائے موت سنائے جانے کے بعد دوسرے دن ملاقات کے لیے آئے ہوئے اپنے بیٹے عمر فاروق مودودی کو تسلی دیتے ہوئے انھوں نے یہ تاریخی الفاظ کہے:

---

(۱) یہ قرارداد اس دستور ساز اسمبلی نے پاس کی جو ۱۹۴۵ء کے ہندستان میں منتخب ہوئی تھی اور جس نے پاکستان کے لیے جدوجہد کی تھی۔ ۱۹۵۶ میں جب ملک کے لیے اسلامی دستور بنا تو اس قرارداد کو بہ طور دیباچہ شامل کیا گیا۔ ایوب خان نے ۱۹۶۲ میں نیا دستور بنایا تو اس کو شامل رکھا۔ ۱۹۸۵ میں ضیاء الحق نے ترمیمی بل کے ذریعے اس کو دستور کے متن میں شامل کر دیا۔

(۲) سید ابوالاعلیٰ مودودی، پروفیسر محمد سلیم، ص ۶۲۔

بیٹا! ذرا نہ گھبرانا۔ اگر میرے پروردگار نے مجھے اپنے پاس بلانا منظور کر لیا ہے تو بندہ بہ خوشی اپنے رب سے جا ملے گا۔ اگر اس کا ہی حکم ابھی نہیں تو پھر چاہے یہ لوگ الٹے بھی لٹک جائیں، مجھے نہیں لٹکا سکتے(۱)

مولانا مودودی کی گرفتاری اور پھر پھانسی کی سزا کے اعلان نے عالم اسلام میں کہرام مچا دیا۔ ملک اور بیرون ملک میں شدید احتجاج اور مظاہرے ہوئے۔ یہ دیکھ کر حکومت نے سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا۔ ان کو جیل میں رہتے ہوئے ۲۵ ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا کہ ایک مقدمے کے سلسلے میں عدالت عالیہ نے ان تمام قوانین کو باطل قرار دے دیا، جنھیں اسمبلی نے نافذ کیا تھا۔ ان میں مارشل لا کا قانون بھی تھا، جس کے تحت مولانا مودودی کو گرفتار کیا گیا تھا۔ اس طرح آپ ۲۹ر اپریل ۱۹۵۵ کو رہا ہو گئے۔

جنرل محمد ایوب خان کے دورِ حکومت میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کو پھر ابتلا کا سامنا کرنا پڑا۔ جماعت اسلامی پر پابندی عائد کر دی گئی اور ۶ر جنوری ۱۹۶۴ کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مجلسِ شوریٰ کے ارکان کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ سید مودودی کی تیسری گرفتاری تھی۔ گرفتاری کے لیے تین الزامات عائد کیے گئے تھے(۲) جو گرفتاری کے گیارہ روز بعد منکشف ہوئے۔

اس مقدمے کی سماعت ایک ریویو بورڈ کے سپرد کر دی گئی، جس کے ایک ممبر جسٹس محمود اور دوسرے ممبر شہزادہ عالم گیر تھے۔ مقدمے کی سماعت بند کمرے میں ہوئی۔ پانچ دنوں کی کارروائی کے بعد ۴ر مارچ ۱۹۶۴ کو بورڈ کی پیشی ختم ہوئی اور ۵ر مارچ ۱۹۶۴ کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے رفقا کو چھے، چھے ماہ قید کی نوید سنائی گئی۔ بعد میں ۶ر ستمبر ۱۹۶۴ کو صوبائی ہوم سیکرٹری نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے رفقا کی قید میں مزید چھے ماہ کی توسیع کر دی۔ ۲۵ر ستمبر ۱۹۶۴ کو سپریم کورٹ نے جماعت پر عائد پابندی کا فیصلہ کالعدم قرار دیا۔ چودھری رحمت الٰہی کی درخواست پر مغربی پاکستان ہائی کورٹ کی اسپیشل بنچ نے ۲۹ر ستمبر سے ۵ر اکتوبر تک اس مقدمے کی سماعت کی۔ پھر جسٹس یعقوب علی خان نے ۹ر اکتوبر ۱۹۶۴ کی صبح ۱۱ بجے نظر بندی کو غیر قانونی قرار دے کر مولانا سید ابوالاعلیٰ اور ۴۳ر اراکین مجلس شوریٰ کو رہا کرنے کا حکم دیا۔

---

(۱) سید ابوالاعلیٰ مودودی، علی سفیان آفاقی، ص ۸۵۔

(۲) پہلا یہ کہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی اقتدار چاہتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ انھوں نے ترجمان القرآن کے شمارہ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں ایران اور اس کی شہنشاہیت پر تنقیدی مضمون شائع کیا۔ اور تیسرا یہ کہ ابوالاعلیٰ مودودی ایک خلاف قانون سیاسی تنظیم کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں۔ (ایک شخص ایک کارواں، ص ۳۵۶)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی چوتھی گرفتاری کا واقعہ بڑا دل چسپ ہے۔حکومت پاکستان کے ذریعے بنائی گئی رویت ہلال کمیٹی نے ۱۱ر جنوری ۱۹۶۷ کی رات پونے آٹھ بجے ریڈیو سے یہ اعلان کروایا تھا کہ مالاکنڈ اور مردان وغیرہ کے علاقوں میں عید الفطر کا چاند نظر آ گیا ہے، لہٰذا عید الفطر ۱۲ر جنوری بہ روز جمعرات منائی جائے گی، جب کہ مطلع صاف رہنے کے باوجود پاکستان اور بھارت کے کسی علاقے میں بھی چاند نظر نہیں آیا تھا۔اس انوکھے انکشاف کی وجہ یہ تھی کہ صدر ایوب خان کو کسی صاحب نے یہ باور کرایا تھا کہ جمعے کے دن (۱۳ر جنوری) عید الفطر ایک حکمراں کے لیے صریح نقصان دہ ہے۔کمیٹی کے اس اعلان اور حکومت کی حمایت نے ملک میں عید منانے کے سلسلے میں ایک انتشار کی صورت اختیار کر لی۔آخر کار مغربی اور مشرقی پاکستان کے علما نے جن میں شیعہ علما بھی شامل تھے، بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ جمعرات (یعنی ۱۲ر جنوری) کو عید نہیں منائی جائے گی۔اس فیصلے سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی اتفاق کیا تھا۔

حکومت کی انتہائی کوششوں کے باوجود عید کے سرکاری اعلان کو عوام نے تسلیم نہیں کیا اور مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں دو عیدیں منائی گئیں۔اگرچہ اس معاملے میں ملک کے علمائے کرام اور عام مسلمان بھی شریک تھے، تاہم غصہ مولانا مودودی پر اتارا گیا۔صدر ایوب خان نے ان کے خلاف میڈیا سے سخت پروپیگنڈہ کیا کہ وہ انتشار پھیلا رہے ہیں۔آخر ۲۹ر جنوری ۱۹۶۷ کو رات ۳ بجے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت انھیں گرفتار کر کے بنوں جیل بھیج دیا گیا جہاں وہ دو ماہ تک نظر بند رہے۔(۱) حکومت کے اس اقدام کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی۔انھیں ۱۶ر مارچ کو بنوں سے لاہور کے بورسٹل جیل کی طرف روانہ کیا گیا۔ابھی جیل کے دروازے تک پہنچے ہی تھے کہ ان کی رہائی کا حکم آ گیا۔

سفر ارض القرآن

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے پہلی مرتبہ ۱۹۵۶ میں حج و زیارت کے لیے ارض مقدس کا سفر کیا تھا۔اس وقت بھی ان کی خواہش تھی کہ وہ تمام قرآنی مقامات و آثار کا بہ چشم خود تفصیلی مشاہدہ

(۱) سید مودودی: دعوت و تحریک، سید اسعد گیلانی، ص ۴۸۵۔

کریں، جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، لیکن صحت کی خرابی اور علمی وتحریکی مصروفیات نے انھیں تین سال تک اس کا موقع نہیں دیا۔

تفہیم القرآن کی تیسری جلد تیار ہو رہی تھی۔ ملک میں مارشل لا کے نفاذ نے سفر ارض القرآن کے لیے انھیں مہلت فراہم کردی۔ چناں چہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے ۳؍نومبر ۱۹۵۹ سے ۵؍فروری ۱۹۶۰ تک عرب ممالک (بحرین، سعودی عرب، اردن، فلسطین، شام، کویت اور مصر) کا طویل سفر اختیار کیا۔ اس سفر میں چودھری غلام محمد اور عاصم الحداد ان کے ہم راہ تھے۔ اس دوران انھوں نے ان تمام آثار و مقامات کی سیر کی، جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ ان کی تصویریں اتاریں، نقشے تیار کیے اور تحقیقی مطالعہ کیا تاکہ تفہیم القرآن کو اس لوازمے کی روشنی میں پیش کیا جاسکے، اور قاری قرآنی پس منظر کا صحیح ادراک کر سکے۔ اس سفر کے دوران ہی میں انھوں نے عالم اسلام کی بہت سی اہم شخصیات سے ملاقاتیں بھی کیں۔

قاتلانہ حملہ

اکتوبر ۱۹۶۳ میں جماعت اسلامی پاکستان کا سالانہ اجتماع بیرون بھاٹی گیٹ لاہور کے گراؤنڈ میں ہو رہا تھا۔ شرکا کی تعداد تقریباً ۱۵ سے ۲۰ ہزار تک تھی، مگر انتظامیہ نے اتنے بڑے اجتماع کے لیے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس کمی کو نوجوان مکبرین پورا کر رہے تھے۔ امیر جماعت مولانا مودودی اجتماع سے خطاب کر رہے تھے کہ اسی دوران غنڈوں نے اجتماع پر ہلّہ بول دیا اور اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی، جس میں ایک کارکن اللہ بخش شہید ہوگئے، لیکن ایسے نازک حالات میں تحریک اسلامی کے کارکنوں نے مثالی صبر واستقامت کا ثبوت دیا۔ غنڈوں کی دہشت گردی انھیں مشتعل نہیں کر سکی۔ مولانا مودودی بہ دستور اسٹیج سے خطاب جاری رکھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگوں نے ان سے کہا: غنڈے گولی چلا رہے ہیں، آپ بیٹھ جائیں مگر اس مردِ حق آگاہ نے اس کا جواب دیا: ”اگر میں بیٹھ گیا تو پھر کھڑا کون رہے گا۔[1]“

---

(۱) اس اجتماع میں یہ مطالبہ پیش کیا جارہا تھا کہ پاکستان کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا جائے۔ بنیادی حقوق بحال کیے جائیں اور بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر انتخاب کرایا جائے، جس کے نتیجے میں ۶؍جنوری ۱۹۶۴ء کو جماعت اسلامی اور ترجمان القرآن پر پابندی عائد کردی گئی۔ دفاتر، کتب، ریکارڈ، بیت المال سب کو مہر بند کر دیا گیا اور عہدے داروں کو حوالۂ زنداں کیا گیا۔ آخر کار ۲۵؍ستمبر ۱۹۶۴ء کو جماعت اسلامی پر پابندی کو ڈھاکا ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ نے منسوخ کردیا۔

شاہ فیصل ایوارڈ

اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے احیا کے لیے تین امور پر حکومت سعودیہ کی طرف سے شاہ فیصل ایوارڈ دیا جاتا ہے۔ایک خدمت اسلام، دوسرے اسلامی لٹریچر اور تیسرے عربی ادب۔ اس میں دو لاکھ سعودی ریال، طلائی تمغہ اور سندِ توصیف شامل ہے۔ یہ ایوارڈ پہلی مرتبہ خدمت اسلام کے لیے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو ۱۹۷۹ میں دیا گیا۔ سید مودودی نے ایوارڈ سے حاصل ہونے والی تقریباً پونے چھے لاکھ کی یہ رقم ادارہ معارف اسلامی کو دے دی اور اپنے پیغام میں فرمایا:

> میں آپ کے اس انعام سے بے حد متاثر ہوا ہوں کہ آپ نے میری حقیر خدمات کی ہمت افزائی کی، جو میں نے خدا کے دین کے سلسلے میں انجام دی ہیں۔ یہ دینِ حق، قوت اور آزادی کا دین ہے۔ میں ان خدمات پر اپنے آپ کو کسی تعریف کا مستحق نہیں سمجھتا۔ یہ میرا فرض تھا اور یہ ہر اس مسلمان کا فرض ہے، جسے اللہ نے اقتدار، طاقت، قابلیت یا دوسرے وسائل عطا کیے ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ میری ان خدمات کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور مجھے وہاں سے اس روز انعام نصیب ہو کہ جس روز اولاد اور مال و متاع کچھ کام نہیں آئیں گے۔(۱)

عوارض

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا جسم بہت مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ بچپن سے جوانی تک انھیں کوئی عارضہ نہیں ہوا تھا۔ جفاکش، مشقت گزار اور خداداد صحت تھی۔ لیکن مسلسل ذہنی وجسمانی کدو کاوش اور ایک طویل قید و بند کی زندگی نے ان کے اعصاب کو بری طرح متاثر کر دیا تھا۔ دوسری طرف انھیں مسلسل اور بے تکان لکھنے کی عادت تھی۔ ایام شباب میں تو یہ مصروفیت کچھ ایسی صورت اختیار کر لیتی کہ راتوں کو جاگتے اور بیٹھ کر لکھتے رہتے۔ مطالعہ و تحقیق اور تصنیف و تالیف کا ذوق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ عمر کے آخری ایام میں بھی یہ مشغلہ جاری رہا۔ نتیجتاً، ان کے جسمانی نظام کا درست رہنا تقریباً ناممکن سا ہو گیا تھا۔ چناں چہ ان کی آنکھیں بری طرح متاثر ہوئیں۔ دیر تک بیٹھ کر لکھنے کی مشق نے جوڑوں میں درد پیدا کر دیا۔ پٹھوں کی ہڈیاں بڑھ گئیں اور

---

(۱) گفتار و افکار، عاصم نعمانی، ص ۳۱۱-۳۱۲۔

اعصاب دب گئے۔ مسلسل بے خوابی نے ایک مرض کی شکل اختیار کرلی۔ انھیں دل کا عارضہ بھی ہوا اور گردے کی تکلیف سے بھی عمر بھر پریشان رہے۔ دواؤں کے کثرتِ استعمال سے معدے اور آنت میں زخم ہوگئے، جو بعد ازاں السر (Ulser) کی شکل اختیار کرگئے۔

ان جسمانی عوارض میں انھیں سب سے زیادہ تکلیف گردوں میں پتھری کی وجہ سے ہوئی۔ گردوں میں پتھریاں مسلسل بن رہی تھیں۔ ان پتھریوں کا یونانی اور ایلوپیتھی طریقے کے ذریعے علاج کیا جاتا رہا۔ لیکن بہ قول ان کے ''پتھر بنانے کی مشین زیادہ تیزی سے کام کرتی رہی اور اتنی تیزی سے ان کو نکالنا ممکن نہ تھا۔'' اس لیے انھوں نے اپنے احباب کے مشورے سے گردے کا پہلا آپریشن امرت سر ہسپتال میں کرایا۔ سرجن ڈاکٹر ریاض قدیر نے ان کے گردے سے پانچ پتھریاں برآمد کیں۔ لیکن آپریشن کے بعد بھی اس گردے میں پتھری بننے کا کام جاری تھا۔[1] جس کے علاج کے لیے انھیں لندن جانا پڑا اور ایک پرائیویٹ کلینک میں اسی گردے کا آپریشن کرایا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس گردے کو نکال دینا ہی بہتر سمجھا۔

۱۹۷۴ میں جوڑوں کے درد اور بے خوابی نے جب شدت اختیار کرلی تو سونے سے پہلے سکون بخش دوائیں استعمال کرنے لگے۔ جب سیاسی حالات اور علمی و تحریکی مصروفیت کے باعث بے خوابی بڑھتی گئی تو انھوں نے خواب آور گولیاں بھی استعمال کرنا شروع کردیں۔ ایک مدت کے بعد ان دواؤں نے بھی اثر دکھانا بند کردیا۔ نتیجتاً دورانِ خون اور حرکتِ قلب بری طرح متأثر ہوئے۔ اسی دوران انھیں دل کے کئی دورے پڑے۔ جوڑوں کا درد بھی پریشان کن تھا، اور بے خوابی مسلسل بڑھتی ہی جارہی تھی۔ ایسے نازک حالات میں ورثا کا متفکر ہونا اور حلقہ احباب کا پریشان ہونا فطری تھا۔ چناں چہ صاحب زادے ڈاکٹر سید احمد فاروق مودودی اور حلقہ احباب کے مشورے سے انھیں ۲۹؍جون ۱۹۷۹ کو امریکا لے جایا گیا، جہاں بفیلو ہسپتال میں جدید آلات کے ذریعے جوڑوں کے درد کا علاج ہوا۔ دو مہینے بعد معدے کے السر کا بھی آپریشن کیا گیا۔ لیکن ۱۳؍ستمبر ۱۹۷۹ء کو انھیں دل کا شدید دورہ پڑا، جس نے جگر اور گردے کے فعل کو بری

---

(۱) جوش ملیح آبادی سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی برسوں کی رفاقت تھی۔ چناں چہ جوش ملیح آبادی ایک پرلطف واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں ان سے ملنے لاہور (اچھرہ) گیا۔ انھوں نے کہا میرے گردے میں پتھری پڑجاتی ہے، نکلواتا ہوں پھر پتھری پڑجاتی ہے۔ میں نے کہا: مولانا! عبرت حاصل کرو، اس لیے کہ تمھیں اندر سے سنگسار کیا جارہا ہے۔ (مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، احمد منیر، ص ۹۶)

طرح متأثر کردیا۔ ۲۲؍ستمبر ۱۹۷۹کودل کا تیسرا اور آخری جان لیوا دورہ پڑا، جو پیامِ اجل ثابت ہوا۔ آخری وقت میں اس مجاہد و محبِّ وطن نے کاغذ قلم منگا کر یہ جملہ لکھا: I am muslim and Pakistani۔ ۲۲؍ستمبر ۱۹۷۹کو پونے چھے بجے شام (پاکستانی وقت کے مطابق) دنیا کو سوگوار کر کے رفیقِ حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

سفرِ آخرت

رحلت کی دوسری صبح یعنی ۲۳؍ستمبر ۱۹۷۹ءکو بفیلو ہی میں ان کی نمازِ جنازہ دوبارادا کی گئی۔ واپسی پر نیو یارک کے کنیڈی ایر پورٹ میں سوگواروں نے نمازِ جنازہ ادا کی۔ ۲۴؍ستمبر ساڑھے دس بجے (اپنی سال گرہ کی صبح) کراچی ایر پورٹ میں پچاس ہزار لوگوں نے نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔ وہاں امیر جماعت اسلامی پاکستان میاں طفیل محمد نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ دوپہر تین بجے لاہور میں ایر پورٹ سے ہوتے ہوئے ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ جنازہ لایا گیا، جہاں رات بھر ملک و بیرون ملک سے آنے والوں نے جسدِ خاکی کی زیارت کی۔ ۲۶؍ستمبر کو لاہور کے قذافی اسٹیڈیم میں ساڑھے دس بجے صبح نماز جنازہ ہوئی۔ عالم اسلام کے مشہور مفکر و عالم دین علامہ یوسف قرضاوی نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ اس جنازے میں اقوام عالم سے لاکھوں افراد شامل ہوئے، مولانا مودودی کے مکان واقع ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور میں انھیں دفن کیا گیا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی رحلت پر عالمی سطح پر بہ کثرت تعزیتی جلسے منعقد ہوئے۔ اخباروں اور رسالوں میں طویل عرصے تک ادبا و شعرا اور ارادت مندوں نے خراج عقیدت پیش کیا اور ان کے افکار، نظریات، حیات و خدمات اور اسلوب و ادب پر مختلف مضامین شائع کیے گئے۔

شخصیت

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ایک دانش ور اور بلند پایہ عالم دین، ایک منفرد مفکر، انشا پرداز اور برعظیم کی ایک ہر دل عزیز شخصیت تھے۔ وہ ایک عظیم انسان تھے، جن کے افکار و نظریات اور تحریروں سے بلا مبالغہ کروڑوں لوگ استفادہ کر رہے ہیں۔ انسان کی تحریر و تقریر، نشست و برخاست اور لباس و خوراک میں ذوق کے معیار سے اس کی شخصیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ آدمی کا سراپا اس کی شخصیت کا پیمانہ ہوتا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مولانا مودودی کی ایک قلمی تصویر بنالی جائے۔ مولانا مودودی کو ایک بھرپور نظر دیکھ لینے کے بعد ذہن کے پردوں پر جو نقوش ابھرتے ہیں اور ان سے جو تصویر بنتی ہے وہ کچھ ایسی ہوگی:

> رنگ گورا، سرخی مائل، موٹے موٹے خدوخال، کشادہ پیشانی، گھنے اور خم دار ابرو، بامروت آنکھیں، ناک ذرا چھوٹی اور موٹی سی، رخسار ہم وار اور ہلکے، ذرا نیچے کی طرف ڈھلکتے ہوئے۔ دانتوں اور مسوڑھوں پر پان کھانے کے اثرات، مشروع ڈاڑھی (کم از کم ڈیڑھ مٹھی)، سر بڑا اور گولائی لیے ہوئے، اس پر بال سیدھے اور باریک، سر پر پٹھے۔ کندھے کشادہ، مگر ذرا جھکے ہوئے، پشت معمولی سی نکلی ہوئی اور جسم گٹھا ہوا فربہی مائل[1]

لباس

لباس بھی شخصیت کا ایک جز ہے۔ لباس محض جسم پوشی ہی نہیں کرتا ہے بلکہ انسان کی شخصیت کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ مولانا مودودی کے ملبوسات ان کی شخصیت کے بھرپور ترجمان ہیں۔ انھوں نے برعظیم کے شرفا کا لباس اختیار کیا تھا، مولانا لباس میں اسلامی وضع کے شدت

(۱) استفادہ از سید مودودی، دعوت و تحریک، سید اسعد گیلانی۔

سے قائل تھے اور غیر قوموں کے ملبوسات کو استعمال کرنا ذہنی غلامی کی دلیل سمجھتے تھے۔ایک مستقل وضع کے مالک، ٹھوس اسلامی اور قومی طرز لباس کے پابند تھے۔

ان کے ملبوسات میں شیروانی، قراقلی اونچی باڑھ کی ٹوپی، تنگ موری کا چوڑی دار پاجامہ، باٹا کا کینوس کا نیوکٹ جوتا، پاؤں میں جرابیں، چمڑے کے موزے وغیرہ خاص تھے۔لنگی کو غیر ساتر سمجھ کر ترک کر دیا تھا۔ملبوسات میں موسم کا بھی خاص خیال رکھتے تھے۔سردیوں اور گرمیوں کے لیے الگ الگ شیروانی ہوتی۔دھاری دار قمیص، اونی سوئیٹر، اونی ٹوپی سردیوں میں اور گرمیوں میں کھلے پائنچوں کا پاجامہ اور کھلی آستینوں کا ململ کا کرتا استعمال کرتے تھے۔

مولانا مودودی خوش پوشاک ضرور تھے، لیکن تنگی کے زمانے میں ان کے کپڑوں پر پیوند بھی دیکھے گئے۔بایں ہمہ صفائی، سادگی اور حسنِ ذوق ان کے لباس کی نمایاں خصوصیت تھی۔لباس کے معاملے میں نمایش اور زیبایش سے ہمیشہ پرہیز کیا کرتے تھے۔یہ الگ بات ہے کہ ان کی خوش ذوقی و خوش لباسی آنکھوں کو تھوڑی دیر کے لیے ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی تھی۔

مرغوبات

مولانا مودودی کے مضامین اور ان کے طرز تحریر میں ایک عالمانہ شان ہے، مگر اس میں سادگی نمایاں ہے۔انھوں نے کھانے پینے کے معاملے میں بھی سادگی اختیار کی تھی۔تاہم جس طرح ان کی تحریروں میں کہیں کہیں طنز و ظرافت اور شایستگی و شگفتگی کا حسین امتزاج نظر آتا ہے، اسی طرح انھیں بعض اشیاے خوردنی نہایت مرغوب تھیں۔ان میں خاص الخاص شب دیگ، ماش کی دال، گاجر کی تری اور نہاری قابل ذکر ہیں۔

'شب دیگ' مولانا کی والدہ مکرمہ کی ہدایت و نگرانی میں عید الاضحیٰ کے موقع پر پکتی تھی، جسے مولانا اپنے رفقا کے ہمراہ خوب مزے لے لے کر کھاتے تھے۔ماش کی دال بڑے شوق سے گھر میں بنواتے اور رفقا کو بھی اس میں شامل کرتے تھے۔البتہ پاکستان بن جانے کے بعد گاجر کی تری سے محروم ہو گئے تھے، لیکن گاجر کی تری کا شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ انھوں نے اپنے رفیق سید امین الحسن رضوی صاحب ایڈیٹر Radiance سے بہ ذریعہ مکتوب اس کی فرمایش کی تھی۔مولانا کے کھانے پینے کا ذوق سادہ اور صاف ستھرا تھا۔مولانا کم خور تھے اور مقامی طرز کے کھانے ہی زیادہ

پسند کرتے تھے۔ مغربی طرز معاشرت سے فطری اجتناب کے باعث چھری اور کانٹے کا استعمال قطعاً گوارا نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ''دست ودہن کے درمیان اگر کوئی تیسری چیز حائل ہو جائے تو کھانے کا مزا غارت ہو جاتا ہے۔(۱)''

مولانا مودودی کو برفاب سے بے حد رغبت تھی۔ گرمیوں میں تو لازماً برفاب ہی استعمال کرتے تھے، مگر سردیوں میں بھی اکثر ٹھنڈے پانی کا مطالبہ کرتے تھے۔ اسی طرح چائے بھی ان کے مرغوب مشروبات میں شامل تھی۔ لیکن ان کے چائے کے ذوق اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ذوق میں بڑا فرق تھا۔ اس سلسلے میں نعیم صدیقی لکھتے ہیں:

> مودودی صاحب اس معاملے میں پنجابی نسخے کے قائل ہیں۔ یعنی چائے کی پتی بھی بہت ہو، دودھ بھی بہت ہو، شکر بھی بہت ہو۔ چناں چہ شکر کے تین چمچے آپ کے لیے پیالے کو میٹھا کرتے ہیں۔(۲)

مولانا مودودی پان کے بہت رسیا تھے۔ ان کے کمرے میں پان کی ڈبیا، بٹوا اور ایک بڑا سا پاندان جس پر نکل پالش کیا ہوا تھا، ضرور رہتا تھا۔ ابتدا میں بغیر تمباکو کے پان کھاتے تھے۔ لیکن ان کے لفظوں میں۔ ''ایک بار کسی صاحب نے تمباکو کا پان کھلا دیا اور اس پان کو کھا کر مجھے گھمائی آئی بس اس گھمائی کے بعد مجھے تمباکو کھانے کی عادت پڑ گئی۔(۳)'' سفر میں ہوں یا حضر میں، پان ان کے ساتھ رہتا تھا۔ پان کو رزق تصور کرتے تھے، مگر اس رزق سے استفادے کا یہ عالم تھا کہ جیل جاتے تو اسے 'طلاق' دے جاتے تھے۔ عموماً، لکھنے یا مطالعے سے قبل پان ضرور کھا لیتے تھے۔ پان کی عادت آخری عمر تک باقی رہی۔ اس کے علاوہ کسی اور چیز کی عادت نہیں تھی۔

گفتگو

انسان حیوانِ ناطق ہے اور نطق سے بڑھ کر شخصیت کا کوئی ترجمان نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ موضوعات کی پسندیدگی کا معیار، الفاظ کا انتخاب، لہجے کا اتار چڑھاؤ، بولنے کی رفتار، آواز کا زیر و بم، بات چیت میں جذبات کی آمیزش اور اس کا تناسب، وہ چیزیں ہیں جو پانچ

---

(۱) المودودی، نعیم صدیقی، ص ۸۶۔
(۲) ایضاً، ص ۵۷۔
(۳) مولانا مودودیؒ اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۲۴۳۔

منٹ میں ایک آدمی کی ساری مخفی حقیقتوں کا خود اسی کی زبان سے اعلان کر دیتی ہیں۔ حضرت شیخ سعدیؒ کی میزانِ مردم شناسی یاد رکھیں ؎

تا مرد سخن نگفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

اور اس میزان پر مولانا کو تول لیں۔

مولانا مودودی کی شخصیت کو ان کے انداز گفتگو اور شگفتہ مزاجی کے آئینے میں دیکھا جاسکتا ہے۔ بات چیت میں ان کا لہجہ عموماً متین، سنجیدہ اور باوقار رہتا تھا، البتہ حسب موقع حاضرین کو شگفتہ گوئی سے محظوظ کرتے۔ پرجوش اور جذبات انگیز گفتگو سے انھوں نے ہمیشہ پرہیز کیا۔ افہام و تفہیم، تمثیل واستدلال اور حسن سلیقہ سے بات اس طرح کرتے تھے کہ سامعین قائل ہوجاتے تھے۔ مولانا نے خشک کلامی، طعن و تشنیع، الزام و بہتان اور فحش و نفرت انگیز کلمات سے ہمیشہ اجتناب کیا۔ فطری طور پر خاموش طبع تھے۔ بلاوجہ بات چیت چھیڑنے یا بات کو طول دینے سے گریز کرتے تھے۔

مولانا کو زبان و بیان پر بہ خوبی قدرت حاصل تھی۔ اسٹیج یا مجلس میں وعظ و نصیحت یا تقریر کے بہ جائے مسلسل گفتگو کرتے تھے، جس میں اعتماد، توکل، تفہیم، مخاطب سے ہم دردی اور مواد کی فراوانی ہوتی تھی۔ جس بات کو پھیلا کر بیان کرتے، اس کے تمام گوشے شرح و بسط سے سامنے لے آتے اور جسے اختصار میں بیان کرتے تو کلام کی جامعیت موضوع کی وضاحت کر دیتی تھی۔ بول چال میں عام فہم اور مقامی زبان بھی بے تکلفی سے استعمال کرتے تھے لیکن اس میں معیار سنجیدگی کو برقرار رکھتے تھے۔

تحریر

مولانا مودودی کی تحریروں میں ان کی نفاست اور سلیقہ مندی کو خاص دخل ہے۔ انھیں غیر ضروری الفاظ اور بناوٹ سے پرہیز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں عام طور سے برجستگی اور آمد کا غلبہ ہے، اور ان کی بیش تر تحریریں قلم برداشتہ ہی ہوتی تھیں۔ کوئی بھی مضمون تحریر کرنے سے قبل اس کے لیے ضروری مواد کی فراہمی، حوالہ جات اور سلسلۂ بحث کی تمام کڑیاں

باہم جوڑ لینے کے بعد ہی وہ قلم کو حرکت دیتے تھے۔ چاہے خط ہو، مضمون ہو یا کچھ اور۔ مولانا سب سے پہلے اسے دماغ کے اوراق پر یک جا کرتے اور پھر اسے زینتِ قرطاس بنا دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں روانی و برجستگی کے نمونے ایک دفینے کی موجودگی کا پتا دیتے ہیں۔

مولانا لکھنے کے لیے ہمیشہ چکنے اور دبیز کاغذ کو پسند فرماتے تھے۔ لکھتے وقت حاشیے کی جگہ چھوڑ دیتے تھے۔ سطر بہ سطر اور حسب ضرورت پیراگراف کا خاص خیال رکھتے تھے۔ عام طور پر فل اسکیپ پیپر پر ہی لکھتے تھے۔ مولانا اپنی تحریروں میں توازن کا خاص طور سے اہتمام کرتے تھے۔ یہ متوازن شخصیت کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔ مولانا کی تحریروں کو دیکھ کر ان کی مستقل مزاجی اور طبعی ضبط و نظم کا پتا چلتا ہے۔

دفتر

مولانا مودودی کا دفتر (جو ان کے لکھنے پڑھنے کا کمرہ بھی تھا) ایک کثیر المقاصد (Multi- purpose) گوشتہ تھا۔ کبھی یہ ملاقاتیوں کا کمرہ، کبھی کانفرنس روم، کبھی پریس روم اور کبھی جماعتی اجلاس کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔ چاروں طرف الماریوں سے گھرے ہوئے اس کمرے میں ان کے مطالعے اور تحریر کے لیے کرسی اور ایک جہازی میز تھی۔ اس میز پر بائیں جانب کاغذات رکھنے کے ایک چھوٹے سے خانہ دار ریک کے ساتھ چند کتابیں، مسودے، پروف، خطوط وغیرہ رکھے رہتے تھے۔ سامنے ایک لمبا چوڑا اگتا پھیلا ہوا اور اس پر لکڑی کا زیر مشق نشست کے بالکل سامنے رکھا رہتا تھا۔ نکل پالش کیا ہوا قلم دان اور پیپر ویٹ، ایک کاغذ، جاذب لگانے کا پیڈ، ایک قلم گیر، ایک خاکستر دان اور ایک گھنٹی ترتیب سے رکھی ہوئی ہوتی تھی۔

مولانا کے دفتر میں رکھی ہوئی چیزوں کے لیے جگہ متعین رہتی تھی۔ دفتر کے اس حسن ترتیب سے ان کی خوش سلیقگی اور نفاست کا اندازہ بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔ مولانا اپنے معمول کے مطابق صبح ناشتے کے بعد وقت مقررہ پر دفتر میں مطالعہ و تحریر کے لیے بیٹھ جاتے تھے۔ دن اور رات کا بیش تر حصہ دفتر ہی میں گزارتے تھے۔

دیگر احوال

مولانا مودودی کے ہاں وقت کی پابندی کا خاص اہتمام تھا۔ ہر کام کے لیے وقت مقرر تھا۔

ابتدائی زمانے میں فجر کے بعد درس قرآن کی مجلس میں شریک ہونے اور کئی میل چلنے کا معمول تھا۔ غسل اور ناشتے کے بعد مطالعہ وتحریر کے لیے وقت مقرر تھا۔ دن کے ایک بجے دو پہر کا کھانا اور رات کا کھانا بعد نماز عشا کھاتے تھے۔ ظہر تا عصر آرام کا وقت ہوتا تھا، اور عصر تا مغرب کا وقت احباب اور ملاقاتیوں کے لیے وقف تھا۔ ملاقاتی ان سے مختلف موضوعات پر استفسار کرتے اور وہ ان کا کافی وشافی جواب دیتے تھے۔[۱] نماز عشا کے بعد گھر تشریف لے جاتے۔ اہل وعیال کے ساتھ کھانا کھاتے، کچھ وقت گزارتے اور پھر دفتر تشریف لا کر مطالعہ وتصنیف میں مصروف ہوجاتے۔

ایک زمانے میں تحقیق وتصنیف کے لیے رات کا استعمال خوب کرتے تھے۔ کام کرتے کرتے کبھی اتنی تاخیر ہوجاتی کہ فجر کی اذان ہوجاتی۔ رمضان المبارک کے ایام میں تراویح کے بعد لکھنے کا عام معمول تھا۔ لکھنے کا کام بہ دست خود کرتے تھے، البتہ مکتوبات وغیرہ کبھی املا کرادیتے یا مضمون بتادیتے تھے۔ کرسی اور میز کا استعمال ہمیشہ کرتے تھے۔ زمین پر بیٹھ کر کبھی نہیں لکھتے تھے۔ لکھنے کی مشق ایسی تھی کہ آخری عمر تک اس کا ساتھ رہا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو روزانہ کثیر تعداد میں خطوط موصول ہوتے تھے، جنھیں وہ خود پوری توجہ سے دیکھتے تھے اور بالعموم انھی خطوط پر جواب لکھ دیتے۔

مولانا اپنا کام خود کرتے، کبھی کبھی گھر کے کاموں میں اہلِ خانہ سے تعاون بھی کرتے تھے۔ بجلی کا فیوز درست کرلیا، گھڑی کی معمولی خرابی دور کرلی، لائبریری کی کتابیں سلیقے سے رکھ لیں، پٹھان کوٹ کے زمانے میں تو لکڑیاں چیر لیتے، گھر کے لیے پانی لے آتے اور بہ وقت ضرورت تانگے کی کوچ بانی بھی کرلیتے تھے۔ ان کی طبیعت میں کسی قسم کی بناوٹ یا تصنع نہیں تھی۔

احباب کی تحقیقِ احوال، عیادت، دعوتوں میں شرکت، ضروریات کے پیش نظر امداد و تعاون ان کے روزمرہ کے مشاغل میں شامل تھا۔ اپنے ملنے جلنے والوں کو خاصا وقت دیتے تھے۔

---

(۱) عصر کے بعد ۵-اے ذیلدار پارک لاہور میں روزانہ مجلسِ عام (عصری مجلس) منعقد ہوتی تھی، جس کی حیثیت بیک وقت دینی مجلس، سیاسی اجتماع، بین الاقوامی تقریب، محفل احباب اور بزم ادب کی ہوتی تھی۔ اس مجلس میں برِ عظیم کے علاوہ افریقہ اور عرب ممالک کے طلبہ، دانش ور، کسان، مزدور، علما اور سیاست داں غرض ہر طرح کے لوگ شریک ہوتے تھے۔

بعض اوقات ان کے آرام اور لکھنے پڑھنے کا وقت بھی اس میں تلف ہوجاتا تھا۔ ان کی خوبی یہ بھی تھی کہ آدمی سے اس کے مرتبے کے مطابق تواضع سے پیش آتے تھے۔

سفر میں عام طور سے سادہ لباس زیب تن کرتے تھے۔ کھلا پاجامہ، قمیص، ٹوپی اور معمولی جوتا پہنتے تھے۔ اپنا بستر اور ایک لوٹا ہمراہ لے جاتے۔ سفر میں اگر دوسرے ساتھی بھی ہمراہ ہوتے تو اسی درجے میں سفر کرتے، جس میں دوسرے سفر کر رہے ہوتے۔ اونچے درجے میں کسی خصوصی تکلیف یا ضرورت کے بغیر بالعموم سفر نہیں کرتے تھے۔(۱)

مولانا مودودی ہمیشہ پابندی سے مسجد میں باجماعت نماز ادا کرتے تھے۔ لیکن عمر کے آخری مرحلے میں جوڑوں کے درد، گردے کی تکلیف اور نزلے کے پے در پے حملوں سے پریشان رہتے تھے۔ اس لیے زیادہ تر نماز مرکز میں ہی رفقا کے ساتھ باجماعت ادا کرتے تھے۔(۲) مسجد جانا ہو، تو گھر سے وضو کر لیتے اور سنتیں ادا کر لیتے تھے۔ مولانا کی نماز ہمیشہ معتدل ہوتی تھی۔ بہ حالتِ نماز'' خفیف سا جھکا ہوا سر، دبے ہوئے کندھے، سمٹا ہوا جسم، فروتنی کا ایک مجسم نمونہ، قراءت کا لہجہ سادہ، صاف اور سوز و گداز کا حامل۔'' الفاظ ٹھہر ٹھہر کر سادہ طریق سے ادا کرتے۔ ہر آیت کا آخری لفظ کھینچ کر پڑھتے اور ہلکا سا وقفہ کر کے آگے چلتے۔(۳)

---

(۱) مولانا کے صاحب زادے روایت کرتے ہیں: '' امی بتا رہی تھیں کہ شادی کے بعد، پہلی دفعہ جب وہ مجھے لے کر میرے میکے جا رہے تھے تو تھرڈ کلاس میں لے کے گئے۔ میرا پورا خاندان مجھے چھوڑنے کے لیے آیا، اور انھوں نے کہا کہ ہماری ناک کٹ جائے گی آپ کو تھرڈ کلاس میں لے کے جا رہے ہیں۔ ہم پیسے دیتے ہیں، آپ فرسٹ کلاس میں جائیے۔ کہنے لگے: میری جیب میں جتنے پیسے ہیں، میں تھرڈ کلاس میں خود جاؤں گا اور جب میرے ساتھ رہنا ہے تو اسے میرے ساتھ تھرڈ کلاس میں جانا پڑے گا اور تھرڈ کلاس ہی میں گئے۔ (راوی: حیدر فاروق مودودی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرتب: احمد منیر)

(۲) نمازِ جمعہ محلے کی مسجد (مسجد رسول پورہ) میں اور بعدازاں جامعہ اشرفیہ میں ادا کرنے جاتے تھے۔

(۳) سید مودودی: دعوت و تحریک، سید اسعد گیلانی، ص ۵۲۔

باب دوم: علمی و ادبی کارنامے

صحافت

صحافت، دور جدید میں ترسیل و ابلاغ کا ایک مؤثر اور بڑا اہم ذریعہ ہے۔ فن طباعت کی ابتدا سے قبل بھی خبروں کی ترسیل کا باقاعدہ نظام تھا۔ مشینی انقلاب کے دور میں اس فن نے اچھی خاصی ترقی کی اور اب برقی تاروں اور مواصلاتی نظام کے مؤثر ذرائع نے موجودہ دور میں ذرائعِ ابلاغ حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا ہے۔ چوں کہ یہ تمام ترقیاں یورپ اور امریکہ کے گہوارے میں ہوئیں اور انھوں نے دنیا کے نظامِ ترسیل و ابلاغ کو بہ راہِ راست متأثر کیا اس لیے فطری طور پر ہماری صحافت پر اس کے اثرات نمایاں ہیں۔

۲۰ ویں صدی کی اردو کی اخباری اور ادبی صحافت آتش فشانی دور سے گزری ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے اردوے معلیٰ، مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال اور البلاغ، مولانا محمد علی جوہر نے ہم درد اور کامریڈ، مولانا ظفر علی خاں نے زمین دار اور مولانا عبدالماجد دریابادی نے سچ، صدق اور صدق جدید کے ذریعے اردو صحافت کو ایک نئی سمت، نئے آہنگ اور جرأت و بے باکی سے روشناس کرایا۔ مولوی عبدالحق نے اپنے مجلّہ 'اردو' کے ذریعے اردو تنقید و تحقیق میں ایک نئے باب کا آغاز کیا اور نیاز فتح پوری نے 'نگار' کے ذریعے جدیدیت کی علم برداری کی۔ ۲۰ ویں صدی کے دیگر مؤقر جریدوں اور اخباروں میں اودھ اخبار، اودھ پنچ، ہمدم، قومی آواز، الندوہ، الجمعیت، مخزن، ترجمان القرآن اور ہمایوں وغیرہ نے بھی ملکی و قومی سرگرمیوں میں گرم جوشی سے حصہ لیا اور علمی، سیاسی، ادبی اور دینی خدمات انجام دیں اور اردو صحافت کی روایت و معیار کو برقرار رکھا۔

۲۰ ویں صدی کی اردو صحافت کے اسی پس منظر میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ ان کا شمار ان چند نام ور اور مشہورِ زمانہ صحافیوں میں ہوتا ہے، جنھیں رہتی دنیا تک یاد کیا جائے گا۔ صحافت ان کے لیے پیشہ یا کاروبار نہیں تھا بلکہ عبادت اور وَتیرۂ زندگی تھا۔

انھوں نے صحافت کا آغاز کم سنی میں ہی بہ حیثیت مدیر کیا تھا اور آخری عمر تک وہ اس سے پوری طرح وابستہ رہے۔ ان کی صحافتی زندگی نصف صدی سے کچھ زائد برسوں پر محیط ہے۔ اس عرصے میں انھوں نے اپنے کثیر الجہت قلم سے فضا میں ارتعاش پیدا کیا، بہت سی فکری لڑائیاں لڑیں، تہذیبِ مغرب کے فریب، مغربی افکار و نظریات کے کھوکھلے پن اور تہذیبی و فکری یلغار کے خلاف صف آرائی کی، تقسیم سے پہلے اور بعد تک کی صحافیانہ زندگی کو احیاے دین اور ملکی و ملی خدمات کے لیے وقف کر دیا۔ اس کے لیے زنداں کی صعوبتیں برداشت کیں اور دار و رسن کی آزمایشوں سے بھی گزرے۔ ان کی شخصیت جس صداقت سے عبارت تھی، اس کا اظہار ان کے ادب و انشا اور علمی و تحریکی نگارشات کے علاوہ ان کی صحافت میں بھی اس بے باکی سے نمایاں ہوا کہ ان جیسا دبنگ لہجہ برعظیم کے دوسرے صحافیوں کو کم ہی نصیب ہوا ہوگا۔

مولانا مودودی نے اپنی صحافت کی ابتدا ۱۹۱۸ میں اخبار مدینہ (بجنور) سے کی، جس میں انھوں نے اپنے بھائی (مدیر) کے معاون کی حیثیت سے کوئی دو ماہ تک کام کیا۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۹۱۹ میں تاج الدین صاحب (انجمن اعانتِ نظر بنداں کے روح رواں) کے ہفتہ وار اخبار تاج (جبل پور) کی ادارت کی، مگر چھے ماہ کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا۔ ۱۹۲۰ میں تاج الدین صاحب نے پھر تاج کا اجرا کیا اور پرانی قرابت داری کے سبب مولانا کو دوبارہ ایڈیٹر مقرر کیا۔ کچھ مدت تک یہ اخبار ہفتہ وار نکلتا رہا اور پھر روزنامہ ہو گیا۔ اس اخبار کی پالیسی آزادیِ ہند اور انگریز مخالفت پر مبنی تھی، اس لیے دوسرے اخباروں کی طرح یہ بھی انگریزی آمریت کا شکار ہوا۔ مولانا کے ایک مضمون پر برٹش حکومت نے سخت گرفت کی اور اس اخبار کو خلافِ قانون قرار دیتے ہوئے اس کی ضمانت ضبط کر لی۔ چوں کہ اخبار کے ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر کی حیثیت سے تاج الدین صاحب کا نام شائع ہوتا تھا، اس لیے حکومت نے انھی پر مقدمہ قائم کیا۔ اس واقعے سے دل برداشتہ ہو کر مولانا دہلی چلے آئے۔ مدینہ اور تاج کی ادارت دراصل ان کی صحافت کے ابتدائی اسباق تھے، جس نے ان کی صحافیانہ صلاحیتوں کو نکھارنے اور سنوارنے کا کام کیا۔

جمعیت علماے ہند کی سرپرستی میں مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے یکم نومبر ۱۹۲۱ کو اخبار مسلم جاری کیا اور ۲۶ رجولائی ۱۹۲۲ کو اس کی ادارت مولانا مودودی کے سپرد کی۔ یہ اخبار بھی ایک سال نو ماہ سات دن جاری رہ کر ۸ راپریل ۱۹۲۳ کو بند ہو گیا۔ اس کے بند ہونے تک مولانا ہی بہ حیثیت مدیر کام کر رہے تھے۔

اس وقت تک ایک مدیر کی حیثیت سے مولانا کی عصری آگہی اور انشا پردازی کی شہرت ہندستان میں پھیل چکی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد یہ دوسری مؤثر آواز تھی۔ ان کی مدیرانہ صلاحیت اور زبان کی اثر انگیزی سے متاثر ہوکر جوہر شناس مولانا محمد علی جوہر نے ۱۹۲۴ میں انھیں اپنے اخبار ہمدرد میں شامل ہونے کی دعوت دی، لیکن اسی اثنا میں جمعیت علماے ہند کا ترجمان سہ روزہ الجمعیت جاری ہوا اور مولانا احمد سعید صاحب (صدر جمعیت علماے ہند) نے قدیم تعلقات کی بنیاد پر مولانا مودودی سے اس کی ادارت قبول کرنے کی درخواست کی۔ مولانا مودودی نے ہمدرد پر الجمعیت کو ترجیح دیتے ہوئے ۲۰/فروری ۱۹۲۵ کو اس کی ادارت سنبھالی۔ مولانا ابتدا ہی سے اس کے ایڈیٹر تھے، مگر ۲۰/فروری تا ۱۳/جون ۱۹۲۵ ایڈیٹر کی حیثیت سے مولانا محمد عرفان صاحب کا نام لکھا جاتا رہا۔ ۱۴/جون ۱۹۲۵ سے بہ حیثیت مدیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نام لکھا جانے لگا۔ یہ اخبار بھی فروری ۱۹۲۵ تا دسمبر ۱۹۲۸ صرف تین سال تک ہی جاری رہ سکا۔(۱) الجمعیت کی ادارت کا دور مولانا کی ذہنی بیداری اور فکری ارتقا کا دور تھا۔ اس دوران انھوں نے ہندستان میں سرگرم مذہبی وسیاسی تحریکوں، مختلف افکار ونظریات کے تصادم اور مسلمانوں کی پستی و زوال کے اسباب کا بہ غور مطالعہ کیا۔

مولانا مودودی جب تک الجمعیت سے وابستہ رہے، حتی الوسع تبلیغ واشاعتِ دین اور تہذیبِ ملت کا کام کرتے رہے۔ الجمعیت کے تمام مضامین، مقالے، شذرات اسی محور کے اردگرد گھومتے تھے۔ چوں کہ یہ ایک سیاسی اخبار تھا اس لیے اس کی تنگنائے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی انبیائی دعوت کے بارے میں کچھ لکھنا زیادہ ممکن نہیں تھا، اس لیے الجمعیت کا ساتھ نبھانا ان کے لیے مشکل ہوگیا اور آخر کار انھوں نے الجمعیت سے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا۔ اپنے اس فیصلے کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

اب وہ زمانہ آگیا جب دس سال (۱۹۱۸-۱۹۲۸) کے مسلسل تجربات نے مجھے

---

(۱) الجمعیت کے جولائی اگست ۱۹۲۵ کے شماروں میں انھوں نے اسلام کا سرچشمۂ قوت کے عنوان سے نوقسطوں میں مضامین لکھے، جو بعد میں اسی عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ الجمعیت میں انھوں نے ایک خصوصی شمارہ ''حبیبِ نمبر'' بھی مرتب کیا تھا۔ اسی زمانے میں انھوں نے دولتِ آصفیہ اور حکومتِ برطانیہ کی تالیف کی تھی۔ یہ کتاب نہ صرف اردو بلکہ ہندستان میں اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے

ہندستان اور خصوصاً اردو زبان کی اخبار نویسی سے بالکل بے زار کر دیا تھا، میرے لیے یہ زندگی سوہانِ روح ہوتی جا رہی تھی۔ آخر کار ۱۹۲۸ کے خاتمے پر میں نے الجمعیت سے قطع تعلق کر لیا۔ اور آیندہ کے لیے تصنیف و تالیف کے شغل کو اپنے لیے پسند کیا۔(۱)

الجمعیت سے علیحدگی کے بعد ۱۹۳۱ میں رسالہ ترجمان القرآن سے وابستگی، مولانا کی اسی تبدیلیِ ذہن کی ترجمان ہے۔ ترجمان القرآن سے مولانا کی صحافت ایک نیا رخ اختیار کرتی ہے، جس پر چلتے ہوئے وہ عام صحافیوں سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔

مولانا ابو محمد مصلح نے ادارہ ''عالم گیر تحریک قرآن'' قائم کیا تھا۔ رسالہ ترجمان القرآن اس ادارے کا ترجمان تھا جو حیدر آباد دکن سے ۱۳۵۱ھ میں جاری ہوا۔ اس کے تیسرے پرچے میں مولانا کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ مولانا اس رسالے کو ۱۹۳۱ میں ادارے کے مالک مولانا ابو محمد مصلح صاحب سے خرید لیا اور ساتویں پرچے سے اس کی ادارت کی ذمے داری خود سنبھال لی۔ دراصل یہ اس کام کی ابتدا تھی، جس کا منصوبہ انھوں نے برسوں پہلے تیار کیا تھا۔

اس رسالے کی اشاعت میں انھیں زبردست دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور ان کی ساری جمع پونجی صرف ہوگئی۔ اجرا کے تیسرے برس میں اس کی اشاعت صرف چھے سو تھی، جس میں تین سو پرچے حکومت آصفیہ دکن خرید لیتی تھی۔ ایک سال ریاست کے محکمۂ امور مذہبی نے رسالہ خریدنے سے انکار کر دیا اور محکمے کے سربراہ (نواب ذوالقدر جنگ بہادر) نے یہ شرط عائد کر دی کہ مولانا خود ان کے پاس حاضر ہو کر اس کی درخواست کریں، لیکن مولانا نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ ''میں قیامت تک اس کام کے لیے ان کے پاس نہیں جاؤں گا۔ یہ میرا نہیں، دین کا کام ہے(۲)''

رسالہ ترجمان القرآن کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ اور دعوت جہاد فی سبیل اللہ تھا یعنی دنیا میں جو افکار و تخیلات اور اصول تہذیب و تمدن پھیل رہے تھے، ان پر قرآنی نقطۂ نظر سے تنقید کرنا اور فلسفہ و سائنس، سیاست و معیشت، تمدن و معاشرت ہر چیز میں قرآن و سنت کے پیش کردہ

---

(۱) مولانا مودودیؒ اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۳۶۔

(۲) مولانا مودودیؒ اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۲۴۰۔

اصولوں کی تشریح کرنا اور زمانۂ جدید کے حالات پر ان اصولوں کو منطبق کرنا، اس رسالے کا خاص موضوع تھا۔ مولانا مودودی نے سخت سے سخت مشکلات اور نامساعد حالات میں بھی اپنا سفر بدستور جاری رکھا۔ اس راہ میں درپیش تمام مزاحمتوں سے نبرد آزمائی کی اور اپنے نصب العین کی طرف کشاں کشاں بڑھتے رہے۔ ترجمان القرآن میں ایک جگہ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> میں نے جن حالات میں اس رسالے کی ادارت سنبھالی تھی، اور بعد میں مسلسل کئی مہینے تک جو مشکلات مجھے پیش آتی رہیں، ان سے یقیناً میرے حوصلے پست ہو جاتے، اگر میرا اعتماد خدا کے بہ جائے دنیاوی اسباب اور خود اپنی قوت پر ہوتا۔(۱)

اپنی خاکساری اور علمی بے بضاعتی کا اظہار اپنے ایک مضمون بعنوان 'فاتحہ' میں اس طرح کرتے ہیں:

> اس کے ساتھ ہی میں اس کا مدعی بھی نہیں ہوں کہ مجھ سے غلطی نہیں ہوسکتی۔ ممکن ہے کہ کسی مسئلے کے سمجھنے اور بیان کرنے میں خود میں غلطی پر ہوں۔ ایسے مواقع پر میں امید کرتا ہوں کہ میری کسی غلطی کو قصد و اختیار پر محمول نہیں کیا جائے گا بلکہ ناواقفیت اور قلتِ فہم کا نتیجہ سمجھا جائے گا اور اہلِ علم حضرات میری اصلاح کی کوشش فرمائیں گے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ کوئی شخص مجھے غلطی پر اصرار کرنے والا ہٹ دھرم نہ پائے گا۔(۲)

مندرجہ بالا بیان سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا مودودی کی نگاہ میں صحافت عبادت تھی اور وہ لکھتے ہوئے ہر لفظ کے لیے خود کو مسئول سمجھتے تھے۔ پھر ان کے نزدیک صحافت کا مقصد خدمتِ دین وملت تھا۔ ترجمان القرآن کے تمام مشمولات اسی مقصد کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ترجمان القرآن کے مشمولات میں جہاں ایک طرف ملک و بیرون ملک کے موجودہ سیاسی و دینی اور تہذیبی و تمدنی مسائل پر اختصار و جامعیت کے ساتھ ''اشارات'' کے عنوان سے دل نشیں اور شگفتہ پیرایے میں تبصرے اور تنقیدیں ملتی ہیں، وہیں دوسری طرف اہم

---

(۱) ترجمان القرآن، ج ۴، عدد ۱، محرم الحرام ۱۳۵۳ھ، ص ۲۔

(۲) ترجمان القرآن، ج ۲، عدد ۱، محرم الحرام ۱۳۵۲ھ، ص ۵۔

دینی، سیاسی اور تاریخی موضوعات پر تنقیدی مقالے اس کا جز ہوتے تھے۔ مختلف النوع موضوعات پر جدید ذہن کے شبہات، اشکالات اور موزوں و ناموزوں اعتراضات کے علمی جوابات کے لیے رسائل و مسائل کے عنوان سے ایک مستقل کالم تھا۔ ان سب کے علاوہ ترجمان القرآن مولانا مودودی کی فکر و نظر اور تحریک اسلامی کا آرگن بھی تھا، اس لیے تحریکِ اسلامی کی تدریجی پیش رفت، اس پر مصائب، مشکلات، عصری مسائل پر اس کے واضح رول اور مولانا مودودی کے مؤقف کی روداد بھی ترجمان القرآن کے صفحات میں بکھری ہوئی ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ رسالہ الوہی پیغام کو عوام الناس تک پہنچانے کا ذریعہ بھی تھا۔ لہٰذا، مولانا نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن کو سلسلہ وار اس رسالے میں شائع کیا۔ سب سے اہم بات یہ کہ مولانا کی بیش تر شہرۂ آفاق تصانیف اولاً اسی رسالے میں شائع ہوئیں اور تنقید، تبصرے اور ترمیم و تنسیخ کے بعد ہی کتابی صورت میں شائع کی گئیں۔ اس رسالے کی ایک اور خصوصیت اس میں نئی مطبوعات پر تبصرے ہیں جن میں معتدل اور متوازن تنقید و تبصرے کی مثالیں ملتی ہیں۔ الغرض ترجمان القرآن اپنے مختلف النوع موضوعات، مخصوص فکری و نظری رجحان اور سحر طراز اندازِ بیان کے باعث ۲۰ ویں صدی کا واحد رسالہ ہے، جو احیاے اسلام اور قومی و ملکی خدمات میں سب سے زیادہ سرگرم رہا ہے۔

مولانا مودودی نے اپنی صحافتی زندگی میں بہت سی فکری اور نظریاتی جنگیں لڑیں۔ ذیل میں چند ایک کی مثالیں دی جائیں گی۔ اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ یہ لڑائیاں کسی ذاتی یا نفسیاتی بنیاد یا علمی برتری کی نمایش کے لیے نہیں بلکہ نظامِ باطل کے مقابلے میں حق کی سربلندی اور فکری کج روی اور نظریاتی فریب کے مقابلے میں راست اسلامی افکار و نظریات کے لیے لڑی گئیں، اس لیے جہاں جہاں انھوں نے نظامِ باطلہ اور افکارِ خبیثہ کے خلاف قلم اٹھایا ہے، ان کے قلم کی کاٹ تیز تلوار سے بھی زیادہ دھاردار ہوگئی ہے۔ یہاں ان کا قلم نہ تو مرعوب ہے اور نہ نرم روی اختیار کرتا ہے بلکہ ان کی تحریروں کی نشتریت ہر پرفریب نظریے کے پرخچے اڑا دیتی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان کے طرزِ استدلال کی سحر کاری اور اندازِ بیان کی اثر پذیری کے باعث ہر باطل فکر اور ہر باطل نظریہ، اپنی تمام وسعت و ہمہ گیری کے باوجود، اپنی جڑیں چھوڑ دیتا ہے۔ مولانا مودودی کا یہی لہجہ انھیں مولانا ابوالکلام آزاد کے طرزِ صحافت سے جدا کرتا ہے۔

مولانا مودودی نے ترجمان القرآن کے ذریعے مسلمانوں میں پھیلی ہوئی تمام گم راہیوں اور بے راہ رویوں پر سخت تنقیدیں کیں اور تعمیر و تطہیرِ معاشرہ کے لیے ایک خدا، ایک انسان، ایک نظام کے فلسفے کو پیش کیا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو ان کے فریضۂ منصبی سے بھی آگاہ کیا۔ اس کے لیے جس طرزِ استدلال اور ادبی پیرایۂ بیان کو انھوں نے اختیار کیا، ملاحظہ کیجیے:

> یہ شریعت بزدلوں اور نامردوں کے لیے نہیں اتری ہے۔ نفس کے بندوں اور دنیا کے غلاموں کے لیے نہیں اتری ہے۔ ہوا کے رخ پر اڑنے والے خس و خاشاک اور پانی کے بہاؤ پر بہنے والے حشرات الارض اور ہر رنگ میں رنگ جانے والے رنگوں کے لیے نہیں اتری ہے۔ یہ ان بہادروں اور شیروں کے لیے اتری ہے، جو ہوا کا رخ بدل دینے کا عزم رکھتے ہیں، جو دریا کی روانی سے لڑنے اور اس کے بہاؤ کو پھیر دینے کی ہمت رکھتے ہیں، جو صبغۃ اللہ کو دنیا کے ہر رنگ سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ اور اسی رنگ میں تمام دنیا کو رنگ دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ مسلمان جس کا نام ہے۔ وہ تو دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی آفرینش کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کے دریا کو اس راستے پر رواں کردے، جو اس کے ایمان و اعتقاد میں راہ راست ہے، صراط مستقیم ہے۔ اگر دریا نے اپنا رخ اس راستے سے پھیر دیا ہے تو اسلام کے دعوے میں وہ شخص جھوٹا ہے، جو اس بدلے ہوئے رُخ پر بہنے کے لیے راضی ہو۔ حقیقت میں جو سچا مسلمان ہے، وہ اس غلط رو دریا کی رفتار سے لڑے گا، اس کا رخ پھیرنے کی کوشش میں اپنی پوری قوت صرف کردے گا، کام یابی اور ناکامی کی اس کو قطعاً پروا نہ ہوگی، وہ ہر اس نقصان کو گوارا کرلے گا جو اس لڑائی میں پہنچے یا پہنچ سکتا ہو، حتیٰ کہ اگر دریا کی روانی سے لڑتے لڑتے اس کے بازو ٹوٹ جائیں، اس کے جوڑ بند ڈھیلے ہوجائیں اور پانی کی موجیں اس کو نیم جان کرکے کسی کنارے پر پھینک دیں، تب بھی اس کی روح ہرگز شکست نہ کھائے گی۔ ایک لمحے کے لیے بھی اس کے دل میں اپنی اس ظاہری نامرادی پر افسوس یا دریا رو پر بہنے والے کافروں یا منافقوں کی کامرانیوں پر رشک کا جذبہ راہ نہ پائے گا۔(۱)

مسلم لیگ کی جاری کردہ تحریکِ پاکستان کی مہم دراصل مسلم قوم پرستی کی ترجمان تھی اور حامیانِ تحریکِ پاکستان مسلم قومیت کے جذبے سے سرشار ہوکر اس تحریک کی حمایت کررہے تھے۔

---

(۱) ترجمان القرآن، صفر ۱۳۵۵ھ، ج ۸ عدد ۲، ص ۷۔

مسلم لیگ کی یہ ساری تگ ودو ''مسلم قوم پرستی'' کے احیا کے لیے ہو رہی تھی، نہ کہ اسلام کے احیا کے لیے۔ مولانا مودودی نے اس ''جغرافیائی قومیت'' کے مقابلے میں ''اسلامی قومیت'' کا تصور پیش کیا، چناں چہ ترجمان القرآن میں ''مسئلہ قومیت'' کے عنوان سے اسلامی قومیت کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> یہاں قومیت کی بنیاد نسل و وطن کے بہ جائے اعتقاد و عمل پر رکھی گئی ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان ہر جنسی امتیاز کے بغیر ایک دوسرے کے شریک حال اور معاون ہیں۔ ایک ہندی مسلمان مصر کا ویسا ہی وفادار شہری بن سکتا ہے جیسا کہ وہ خود ہندستان کا ہے۔ ایک افغانی مسلمان شام کی حفاظت کے لیے اسی جانبازی کے ساتھ لڑ سکتا ہے، جس کے ساتھ وہ خود افغانستان کے لیے لڑتا ہے۔ اس لیے ایک ملک کے مسلمان اور دوسرے ملک کے مسلمان میں جغرافیائی یا نسلی تفریق کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس معاملے میں اسلام کے اصول اور مغرب کے اصول ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں، جو وہاں سبب قوت ہے وہ یہاں عین سبب ضعف ہے اور جو یہاں مایۂ حیات ہے وہ وہاں بعینہٖ سمِ قاتل ہے۔[1]

مولانا مودودی کے نزدیک مسلم قوم پرستی ایک فتنہ تھی اور اس کے اثرات وطنیت اور قومیت کے فتنے سے کچھ کم نہ تھے۔ انھوں نے مسلم قوم پرستی کے اس باطل تصوّر پر خوب نشتر چلائے اور مسلمانوں میں اسلامی روح بیدار کرنے کی کوشش کی۔

مولانا مودودی کی صحافت کے وسیع اور متنوع موضوعات میں سے بہ خوفِ طوالت صرف چند مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ترجمان القرآن میں بیسیوں علمی و ادبی اور دعوتی و تحریکی مضامین شائع کیے۔ نیاز فتح پوری کی عقلیت پرستی اور دانش نگاری کے جواب میں ''تجدد کا پائے چوبیں'' (۱۹۳۳)، ''عقلیت کا فریب'' (اول، ۱۹۳۴)، ''عقلیت کا فریب'' (دوم، ۱۹۳۶) لکھا۔ اباحیت اور شہوت پرستی کی طرف بڑھتے رجحان کے خلاف ''اسلام اور ضبطِ ولادت'' (۱۹۳۵)، مغربی تہذیب و تمدن کے مہلک اثرات کو بے نقاب کرنے کے لیے ''دورِ جدید کی بیمار قومیں'' (۱۹۳۵)، ''مغربی تہذیب کی خودکشی'' (۱۹۳۲) ''انسانی قانون اور الٰہی قانون'' (۱۹۳۴) اور ''لارڈ لوتھین کا خطبہ'' (۱۹۳۸) جیسے تنقیحات لکھے۔ مسلمانوں کی دینی و

---

(۱) مسئلۂ قومیت، ص ۵۵-۵۶۔

اخلاقی اور فکری و عملی پستی و زوال اور اس کے اسلامی حل کے لیے ''ہماری دینی بیماری کے اسباب'' (۱۹۳۴) اور ''ہندستان میں اسلامی تہذیب کا انحطاط'' (۱۹۳۴) لکھا۔ مسلمانوں میں تعلیمی پس ماندگی کے اسباب اور اس کے حل کے لیے ہمارے ''نظام تعلیم کا بنیادی نقص'' (۱۹۳۶) اور ''مسلمانوں کے لیے جدید تعلیمی پالیسی اور لائحۂ عمل'' (۱۹۳۶) لکھا۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ مولانا مودودی کی بیش تر تصانیف پہلے ترجمان القرآن میں سلسلہ وار شائع ہوئیں، پھر انھیں کتابی شکل دی گئی۔ اس ضمن میں پردہ، حقوق الزوجین، تفہیمات (پانچ حصے) تنقیحات، تفہیم القرآن (چھے جلدیں)، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی وغیرہ شہرۂ آفاق تصانیف اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

ترجمان القرآن میں مولانا مودودی نے ایک مستقل کالم ''رسائل ومسائل'' کے عنوان سے قائم کیا تھا۔ اس میں عہد حاضر میں پیدا ہونے والے علمی وادبی، فقہی ومسلکی، سیاسی وتاریخی اور تہذیبی ومعاشرتی مسائل نیز، قرآن وحدیث کے احکام ومطالب سے متعلق سوالات واشکالات کے جوابات دیے جاتے تھے۔ مولانا ان سوالات کے حکیمانہ، دل کش اور اطمینان بخش جواب دیا کرتے تھے۔ چوں کہ مولانا کی نظر جہاں ایک طرف تمام علومِ قدیم وجدید پر تھی، وہیں دوسری طرف وہ سائل کی ذہنیت اور نفسیات، نیز اس پس منظر سے بھی اچھی طرح واقف تھے، جن سے سوالات برآمد ہوتے تھے، اس لیے جدید ذہن کے لیے تشفی بخش اور موزوں ترین حکیمانہ صورت کیا ہوسکتی تھی، مولانا مودودی خوب جانتے تھے۔ ترجمان القرآن میں شائع شدہ سوالات و جوابات رسائل ومسائل نامی کتاب کی شکل میں پانچ حصوں میں شائع ہوچکے ہیں۔[۱]

ترجمان القرآن میں نئی کتابوں اور رسائل پر تبصرے بھی شائع ہوتے تھے۔ تبصرہ نگاری نہایت ذمے داری اور دیانت داری کا کام ہے، جو اعتدال اور توازن کا متقاضی ہے۔ ایک تبصرہ نگار کسی کتاب کے جوہر کا پتا لگاتا ہے اور اس کی جملہ خوبیوں اور خامیوں کو ناظرین کے سامنے اجاگر کرتا ہے۔ نیز، اس کی ذمے داری یہ بھی ہے کہ وہ مصنف اور پبلشر کو کتابت وطباعت کی غلطیوں سے بروقت آگاہ کردے تاکہ آیندہ کی اشاعت میں ان غلطیوں کا اعادہ نہ ہوسکے۔ ترجمان القرآن میں مختلف علمی وادبی اور مذہبی وتاریخی کتابوں پر عمدہ تبصرے ملتے ہیں۔ ان تبصروں میں اعتدال و

---

(۱) رسائل ومسائل کل سات حصوں پر مشتمل ہے۔ ششم اور ہفتم میں جوابات ملک غلام علی صاحب کے قلم سے ہیں۔

توازن کے ساتھ تنقید کے جملہ لوازمات کا بھی خیال رکھا جاتا تھا، پروفیسر خورشید احمد نے ترجمان میں شائع شدہ، مولانا کے تبصروں کا مجموعہ ادبیاتِ مودودی کے نام سے مرتب کر کے شائع کرایا ہے۔

صحافت میں سرخیوں کا بڑا اہم رول ہوتا ہے۔ یہ سرخیاں نہ صرف قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچتی ہیں بلکہ اس سے مدیر کے ذوق اور طبیعت سے بھی آشنائی ہوتی ہے۔ مولانا مودودی کی سرخیاں عام طور پر سادہ و شایستہ ہیں جنھیں دیکھ کر بہ آسانی موضوع اور مضمون کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، مگر ان کی صحافتی نگارشات میں کہیں کہیں نادر، معنی خیز اور جاذبِ نظر سرخیاں بھی نظر نواز ہوتی ہیں۔ مثلاً نیاز فتح پوری کی عقلیت پرستی اور تجدُّد پسندی کے جواب میں انھوں نے جو تنقیدی مضمون ''تجدد کا پاے چوبیں'' کے عنوان سے لکھا ہے، نیاز فتح پوری کی عقل و فہم کا بہترین عکاس ہے۔ اسی طرح سود کی حمایت کرنے والوں پر تنقید کرتے ہوئے یہ سرخی ''کیشِ مرداں نہ کہ مذہب گوسفنداں'' کتنا معنی خیز، پرلطف اور موزوں معلوم ہوتا ہے۔ اس قسم کی معنی خیز اور جاذبِ نظر سرخیوں میں ''دام ہم رنگِ زمیں''، ''فکرِ انسانی کی المناک رسائی''، ''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے''، ''راہ روپشت بہ منزل'' وغیرہ مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔

تقسیم ہند میں صحافت نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے، کیوں کہ صحافت راے عامہ کی ترجمانی کرتی ہے۔ جب ہندستان میں مختلف سیاسی تحریکیں سرگرم تھیں اور تقسیم کا مسئلہ درپیش تھا، اس دور میں مسلم صحافیوں کا ایک گروہ نیشنلسٹ زاویۂ نگاہ کا حامی تھا اور دوسرا مسلم لیگ کا مویّد۔ ترجمان القرآن نے تو قوم پرستی اور متحدہ قومیت کے خلاف صف آرائی کی ہی تھی۔ چوں کہ مولانا مودودی کا مطمحِ نظر اسلام کا احیا تھا اس لیے وہ دوقومی نظریے کے حامی تھے۔ ترجمان القرآن کا مقصد اعلاے کلمۃ اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ تھا، اس لیے انھوں نے اسی بڑے مقصد پر زور صرف کیا ہے۔

مولانا مودودی کی صحافت میں، بلکہ ان کی تمام نگارشات میں جو چیز سب سے زیادہ مؤثر، پرکار اور مسحور کن ہے، وہ ان کا منفرد اسلوبِ تحریر ہے۔ وہ بیک وقت باکمال انشا پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ حکیم و فلسفی، خطیب و ناصح، معالج اور جرّاح بھی تھے۔ انھوں نے اپنی صحافت کے ذریعے سماج اور معاشرے سے لے کر بین الاقوامی محاذ پر پھیلے ہوئے امراض کی حکیمانہ جرّاحی کی ہے۔ اپنے اسلوب کی تاثیر میں انھوں نے کہیں بھی تکلف و تصنّع سے کام نہیں لیا ہے بلکہ سادہ و دل نشیں پیرایۂ بیان کو طرزِ اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ ان کا طرزِ تحریر بہت متوازن اور

معتدل ہے، لیکن انھوں نے صحافت کے لیے خشک اخباری زبان استعمال نہیں کی ہے۔ ان کے اسلوب میں بعض مقامات پر گہرے طنز، پر لطف ظرافت، تمثیل نگاری اور سائنٹی فک تنقید کی مثالیں نمایاں ہیں۔ ان کے اسلوبِ تحریر کا ایک نمونہ دیکھیے:

> اس تحریک نے ایک حد تک ہماری دنیا ضرور بنا دی، مگر جتنی دنیا بنائی، اس سے زیادہ ہمارے دین کو بگاڑ دیا۔ اس نے ہم میں ''کالے فرنگی'' پیدا کیے، اس نے ہم میں ''اینگلو محمڈن'' اور ''اینگلو انڈین'' پیدا کیے اور وہ بھی ایسے جن کی نفسیات میں 'محمڈن' اور 'انڈین' کا تناسب بس برائے نام ہی ہے۔ اس نے ہماری قوم کے طبقۂ علیا اور طبقۂ متوسط کو، جو دراصل قوم کے اعضائے رئیسہ ہیں، باطنی وظاہری دونوں حیثیتوں سے یورپ کی مادی تہذیب کے ہاتھوں فروخت کر دیا، صرف اتنے معاوضے پر کہ چند عہدے، چند خطابات، چند کرسیاں ایسے لوگوں کو مل جائیں جن کے نام مسلمانوں سے ملتے جلتے ہوں۔ سوال یہ ہے کہ کیا دائماً ہماری یہی تعلیمی پالیسی رہنی چاہیے؟ فی الواقع اگر یہی ہماری دائمی پالیسی ہے تو اس کے لیے علی گڑھ کی کوئی ضرورت اب باقی نہیں رہی۔ ہندستان کے ہر بڑے مقام پر ایک 'علی گڑھ' موجود ہے جہاں سے دھڑا دھڑ 'اینگلو محمڈن' اور 'اینگلو انڈین' نکل رہے ہیں۔ پھر یہ بس بھری فصل کاٹنے کے لیے ہم کو اپنا مستقل مزرعہ رکھنے کی حاجت ہی کیا ہے؟(۱)

۲۰ ویں صدی کی اردو صحافت میں مولانا مودودی کے مقام کی تعین سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان کا صحافتی میدان کیا تھا۔ ترجمان القرآن کی نوعیت 'الہلال' اور 'البلاغ'، 'کامریڈ' اور ہمدرد'، 'نگار' اور 'ساقی' وغیرہ سے یک سر مختلف تھی۔ اس رسالے کا تعلق معروف معنوں میں صرف مذہب یا سیاست سے نہ تھا بلکہ یہ بنیادی طور پر دعوتی وتحریکی مزاج کا ترجمان تھا۔ اس رسالے کی حیثیت تجارتی اور کاروباری نہیں تھی بلکہ اس کا مقصد دین وملت کی خدمات انجام دینا تھا۔ چوں کہ مولانا مودودی کے معتقدین اور تحریکِ اسلامی سے وابستہ افراد کا حلقہ

(۱) ترجمان القرآن، جلد ۸، عدد ۵، مضمون ''اشارات''، جولائی ۱۹۳۶ء، ص ۳۹۵۔

برعظیم کے علاوہ بیرونی ممالک تک پھیلا ہوا تھا، اس لیے اس رسالے کی اشاعت بہت وسیع پیمانے پر ہوتی تھی۔ ۲۰ ویں صدی کا شاید ہی کوئی دعوتی وتحریکی نوعیت کا رسالہ ہوگا جس کے قارئین کا حلقہ اس قدر وسیع ہوگا۔ مختلف النوع مضامین، رائے عامہ کی رہ نمائی، عصری مسائل کی پیش کش اور اپنے مخصوص تنقیدی نقطۂ نظر اور دل نشیں طرزِ بیان کے لحاظ سے ترجمان القرآن کا شمار ان چند اہم رسالوں میں ہوتا ہے، جس نے اقتضائے حالات کے تحت اہم اور کلیدی رول ادا کیا ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو صحافت میں مولانا مودودی کا مقام ان چند صحافیوں میں ہے، جنھوں نے اپنے قلم کے ذریعے ۲۰ ویں صدی کی تمام علمی و عملی اور فکری ونظری یلغار کے خلاف صف آرائی کی اور اپنے اسلوبِ بیان اور اندازِ نگارش کا بھی علمی و ادبی دنیا سے لوہا منوایا۔

سوانح نویسی

علمی وادبی حیثیت کے علاوہ مولانا مودودی کی حیثیت ایک سوانح نگار کی بھی ہے۔ انھوں نے مختلف مشاہیر اور نام ور اشخاص کی سیرت پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کی سوانح نگاری کا جائزہ لینے سے قبل اردو میں سوانح نگاری کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔

سوانح عمری ایک انسان کی داستان حیات ہے یا اس کی مہماتِ حیات کی ہو بہو تصویر[۱]۔ بہ ہر حال اس کا مقصد شخصیت کا سچا اظہار ہی ہے۔ سوانح نگار کو حق پسندی اور راست گوئی کی راہ پر چلتے ہوئے شخصیت کے تمام محاسن و معائب کو پیش کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہونی چاہیے کہ یہی سوانح نگار کا منصبی تقاضا ہے۔ سوانح نگاری کی تاریخ میں پیغمبروں، صوفیوں، بادشاہوں، مذہبی و سیاسی رہ نماؤں اور عظیم شاعروں اور ادیبوں کی سیرت و کردار اور علمی و اخلاقی کارناموں کا ذکر ملتا ہے[۲]۔ لیکن ان میں ان کے رازہائے دروں سے چشم پوشی بلکہ پردہ پوشی کی جاتی تھی۔ عقیدت و ارادت کے اس رجحان نے سوانح نگاری میں شخصیت پرستی کو راہ دی، جو اس فن کے نشو و ارتقا میں سب سے زیادہ مزاحم رہا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالؔی اردو کے پہلے باقاعدہ مسلّمہ اور معتبر سوانح نگار تھے۔ ان سے لے کر مولانا آزاد، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ تک اردو میں سوانح نگاری نے ایک طویل ارتقائی سفر طے کیا، جس میں مختلف اقسام کی سوانحی و نیم سوانحی کاوشیں

(۱) اردو میں سوانح نگاری، سید شاہ علی، ص ۹۵۔

(۲) اڈمنڈ گوز: مقالہ: Biography مشمولہ: انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا۔

شامل ہیں۔ کہیں مغربی تہذیب کو انقلاب کا ذریعہ تصور کیا گیا اور کہیں اسلاف کے کارناموں کو نشأتِ ثانیہ کے لیے ضروری قرار دیا گیا۔ اس نئے جذبے اور طرزِ احساس نے سیرت وسوانح نگاری میں ایک نئے طرز کی بناڈالی اور اس طرح منطقی طرزِ استدلال اور عقلی وفکری دلائل کا غلبہ سیرت کی کتابوں میں ہونے لگا۔ اس نئے دور میں سیرت وشخصیت کا افادی نقطۂ نظر حاوی رہا ہے۔ اس نظریے کے پیشِ نظر سیرت وشخصیت کے جو بہترین نمونے سامنے آتے ہیں ان میں عبدالسلام ندوی کی 'سیرت عمر بن عبدالعزیز'، عبدالرزاق کان پوری کی 'نظام الملک طوسی'، حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی 'ذکر جمیل'، 'سیرت صدیقؓ'، غلام رسول مہرؔ کی 'غالب'، شیخ محمد اکرام کی 'یادگار شبلی'، نعیم صدیقی کی 'محسن انسانیت'، سید نذیر نیازی کی 'دانائے راز'، عبدالماجد دریابادی کی 'سیرت نبوی قرآنی'، اور مولانا مودودی کی 'سیرت سرورِ عالمؐ' اور دیگر مشاہیر وقت کی سیرت وشخصیت پر متعدد اہل قلم کی کتابیں شامل ہیں۔ بہ ہر حال سوانح وسیرت کی یہ تمام کتابیں اپنی خوبیوں اور خامیوں اور اجمال اور تفصیل سے عبارت ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں جو صرف سیرت ہیں یا سوانح اور بعض میں ان دونوں کا حسین امتزاج ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی سیرت نگاری کا سب سے اہم کارنامہ سیرتِ سرورِ عالمؐ ہے، جو دو جلدوں پر مشتمل ہے اور جسے جناب نعیم صدیقی اور مولانا عبدالوکیل علوی نے مرتب کیا ہے۔ سیرت سرورِ عالمؐ میں مشمولہ مضامین دراصل مولانا مودودی کے وسیع لٹریچر اور بنیادی طور سے ماہ نامہ ترجمان القرآن اور تفہیم القرآن سے ماخوذ ومرتب کردہ ہیں۔ سیرت سرورِ عالمؐ کی پہلی جلد کا تعلق بنیادی مباحث، منصبِ نبوت اور نظامِ وحی، بعثتِ رسولؐ اور ماقبلِ بعثت کے ماحول، دعوت کی مخاطب قوم اور عرب کے مختلف گروہوں کے احوال سے ہے اور دوسری جلد حضورِ اکرمؐ کی پیدائشِ مبارکہ سے لے کر ہجرت مدینہ تک کے احوال وواقعات پر مشتمل ہے۔(۱)

مولانا مودودی کی سیرت نگاری کا جائزہ لینے سے قبل سیرتِ سرورِ عالمؐ کی چند خصوصیات کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ذیل میں سیرتِ سرورِ عالمؐ کی چند امتیازی خصوصیات پیش کی جارہی ہیں:

۱- سیرتِ سرورِ عالمؐ کے مطالعے سے سب سے پہلی بات جو ایک قاری کو محسوس ہوتی ہے وہ

(۱) ادارہ معارف اسلامی لاہور نے تیسری جلد تیار کرلی ہے، جو تدوین کے مرحلے میں ہے۔ (ناشر)

مولانا مودودی کی تحقیقی نظر اور گہری ارادت مندی مگر غلو سے پرہیز ہے۔ مولانا ایک عاشقِ رسول اور محبِ اسلام ضرور ہیں مگر ان سب کے ساتھ وہ ایک محقق و ناقد بھی ہیں، اس لیے اس میں ان واقعات و احوال کا ذکر نہیں ملتا جسے بعض سیرت نگاروں نے محض اظہارِ عقیدت کے جذبے سے بلا تحقیق پیش کر دیا ہے۔

۲- سیرتِ رسولؐ قرآن کی بہترین تفسیر و تعبیر ہے (کان خلقه القرآن) اور سیرتِ سرورِ عالمؐ قرآن کے پیش کردہ نبیِ برحق کی سیرت مقدسہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی سیرت کو پیش کرنے میں مولانا نے قرآن ہی کو اصل اساس اور بنیادی ذریعۂ معلومات تسلیم کیا ہے، اس لیے انھوں نے جہاں کہیں بھی حضور اکرم ﷺ کی سیرت کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے، وہاں قرآنی آیات کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔

۳- مولانا مودودی کی تمام نگارشات میں دعوتی و تحریکی رنگ نمایاں ہے۔ لہٰذا سیرتِ سرورِ عالمؐ کی تالیف کے پیش نظر بھی یہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ چناں چہ سیرتِ سرورِ عالمؐ کے آئینے میں ہم دعوت و تحریک کا کام، نظمِ جماعت، طریقۂ انقلاب، تطہیرِ معاشرہ، سیرت و اخلاق کی تعمیر، طریقِ حکومت، اسلامی ریاست کے اصول و مبادیات جیسے اہم امور کے متعلق رہ نما اصول اور واضح اشارات دیکھ سکتے ہیں۔

۴- سیرتِ سرورِ عالمؐ کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ مولانا مودودی نے اس میں جن جن علاقوں، پہاڑوں اور مقامات کا تذکرہ کیا ہے، ان کے نقشے اور تصاویر بھی ساتھ ہی پیش کر دیے ہیں۔ اس طرح حضور اکرم ﷺ کی شخصیت اور مختلف علاقوں میں دعوتی و تحریکی مشن کی سرگرمی اور مقاماتِ متعلقہ کے مطالعے میں یہ تصویریں اور نقشے کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔

۵- سیرتِ سرورِ عالمؐ ترتیب وار، مربوط اور مبسوط سیرتِ رسولؐ ہے۔ اس میں واقعات و حوادث کی حقیقت، پس منظر، نزولِ وحی، دلائلِ نبوت، دعوت کی راہ میں مصائب و مشکلات جیسے امور کو حکیمانہ ترتیب کے ساتھ ایک مربوط اور منضبط کتاب کی شکل دی گئی ہے۔

۶- اس کتاب کی ایک اور خصوصیت اس میں پیش کردہ حواشی و حوالہ جات کی ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین میں جن کتابوں سے اخذ و استفادہ کیا گیا ہے، اس کی نمبر وار فہرست پیش

کر دی گئی ہے اور ساتھ ہی بعض وضاحت طلب اہم مباحث کو حواشی کے ذیل میں بیان کر دیا گیا ہے۔

۷- اس کی نمایاں خصوصیت اس کا دل نشیں اور دل پذیر اسلوب ہے۔ یہ کتاب مولانا مودودی کے طرزِ نگارش، اندازِ فکر، محققانہ نظر اور مؤرّخانہ بصیرت کی بہترین عکاس ہے۔

مولانا مودودی کی سیرت نگاری کا قابل فخر کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سیرت نبویؐ کے تمام پہلوؤں کا استخراج قرآن حکیم سے کیا ہے۔ چناں چہ حضور کی جامع حیثیات اور مختلف صفات مثلاً: حضور علیہ السلام کی تاریخ ساز شخصیت، کمال درجے کی راست بازی، تمام نوعِ انسانی کے لیے ذریعۂ ہدایت، بشیر و نذیر ہونا، تمام انسانوں کے لیے خدا کی رحمت، خاتم النبین، معلم، مربّی اور نمونہ، پیشوا، شارحِ کتاب اللہ، قاضی، حاکم و فرماں روا، شافعِ روزِ محشر ہے۔ آپ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو قرآنی آیات کی روشنی میں دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان حقائق کو پیش کرنے میں ان کا تحقیق و تفحص، منطقی استدلال اور عشق رسولؐ کا جذبہ کارفرما ہے۔ اس داعیِ انقلاب اور فخرِ موجودات کی سیرت و شخصیت اور صفات و کمالات کے اظہار کے لیے بے جان الفاظ کفایت نہیں کر سکتے تھے۔ مولانا مودودی نے اس کے لیے زندہ اسلوب اور شستہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> انسانی تاریخ کے منظر میں اس حیرت انگیز انسان کی بلند و بالا شخصیت اتنی ابھری ہوئی نظر آتی ہے کہ ابتدا سے لے کر اب تک کے بڑے سے بڑے تاریخی انسان جن کو دنیا اکابر (Heroes) میں شمار کرتی ہے، جب اس کے مقابلے میں لائے جاتے ہیں تو اس کے آگے بونے نظر آتے ہیں۔ دنیا کے اکابر میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے کمال کی چمک دمک انسانی زندگی کے ایک دو شعبوں سے آگے بڑھ سکی ہو۔ کوئی نظریات کا بادشاہ ہے، مگر عملی قوت نہیں رکھتا۔ کوئی عمل کا پتلا ہے، مگر فکر میں کم زور ہے۔ کسی کے کمالات سیاسی تدبر تک محدود ہیں۔ کوئی محض فوجی ذہانت کا مظہر ہے۔ کسی کی نظر اجتماعی زندگی کے ایک پہلو پر اتنی زیادہ گہری جمی ہے کہ دوسرے پہلو اوجھل ہو گئے۔ کسی نے اخلاق اور روحانیت کو لیا تو معیشت و سیاست کو بھلا دیا۔ کسی نے معیشت و سیاست کو لیا تو اخلاق و روحانیت کو نظر انداز کر دیا۔ غرض، تاریخ میں ہر طرف یک رخے ہیرو ہی نظر آتے ہیں، مگر تنہا یہی ایک شخصیت ایسی ہے، جس میں تمام

کمالات جمع ہیں۔ وہ خود ہی فلسفی اور حکیم بھی ہے اور خود ہی اپنے فلسفے کو عملی زندگی میں نافذ کرنے والا بھی۔ وہ سیاسی مدبّر بھی ہے، فوجی لیڈر بھی، واضعِ قانون بھی ہے، معلمِ اخلاق بھی ہے، مذہبی اور روحانی پیشوا بھی ہے۔ اس کی نظر انسان کی پوری زندگی پر پھیلتی ہے اور چھوٹی چھوٹی تفصیلات تک جاتی ہے۔ کھانے اور پینے کے آداب اور جسم کی صفائی کے طریقوں سے لے کر بین الاقوامی تعلقات تک، ایک ایک چیز کے متعلق وہ احکام اور ہدایات دیتا ہے، اپنے نظریات کے مطابق ایک تہذیب (Civilization) وجود میں لا کر دکھا دیتا ہے اور زندگی کے تمام مختلف پہلوؤں میں ایسا صحیح توازن (Equlibirium) قائم کرتا ہے کہ افراط و تفریط کا کہیں نشان تک نظر نہیں آتا۔ کیا اس جامعیت کا کوئی دوسرا شخص تمھاری نظر میں ہے۔(۱)

سیرتِ سرورِ عالمؐ میں مولانا مودودی نے جہاں حضورِ اکرم ﷺ کی سیرت و شخصیت، احوال و کوائف، ان کی مختلف حیثیات اور کارناموں پر تحقیقی نظر ڈالی ہے، وہیں انھوں نے مختلف علمی و منطقی مباحث مثلاً بشریتِ انبیا، عصمتِ انبیا، ختمِ نبوت، مسیحِ موعود کی حقیقت، رسولؐ کی شخصی دنیوی حیثیت، مذہب کا جاہلی تصور اور اسلامی تصور، واقعۂ شق القمر، معجزاتِ نبوی کی حقیقت، مسئلۂ شفاعت، ظہورِ مہدی و دجّال کی واقعیت، سیرتِ رسولؐ اور مستشرقین، واقعۂ معراج کی اصل حقیقت، حضور ﷺ کی پیشین گوئیاں اور یہودیت و نصرانیت جیسے اہم موضوعات و عنوانات کو متنِ قرآن کی روشنی میں پیش کی ہے۔ مولانا مودودی نے ان تمام حالات و واقعات اور موضوعات و مباحث کی حقیقی نوعیت، علمی و عقلی اعتبار سے اس کے استناد، عقیدہ و عمل پر اس کے اثرات، علمائے مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات اور تاریخی اور تحقیقی اعتبار سے صورتِ واقعہ کو پیش کرنے میں حد درجہ احتیاط، تحقیق و تنقید اور علم و عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کا کام کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے حیاتِ طیبہؐ کے اہم گوشوں مثلاً: ظہورِ محمدؐ کی پیش گوئیاں، خاندان عالی، ولادت و بشارت، رضاعت، فضائل و خصائص، مشاغل، دورِ تحنّث، وحی و نبوت، دعوت و تبلیغ، مصائب و مشکلات، اخلاقی تعلیمات، تاسیسِ امت، یہود و نصاریٰ کی سازشیں، منافقین کا طرزِ عمل، تربیتِ صحابہ، مہاجرت اور خانگی و ازدواجی زندگی وغیرہ کے استخراج میں اپنی مہارت اور قرآن پر عمقِ نظر کا ثبوت دیا ہے۔

---

(۱) سیرتِ سرورِ عالمؐ، اول، ص ۱۱۸

حضور اکرم ﷺ کی تاریخ ولادت، واقعۂ شق القمر، بعثت سے قبل علمِ نبوت، واقعۂ معراج، نکاحِ عائشہ، واقعۂ اِفک، مسئلۂ تعدّد ازواج اور مستشرقین کے اعتراضات وغیرہ مسائل و واقعات کے بیان میں اکثر سیرت نگاروں نے سخت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ مولانا مودودی نے ان تمام مسائل اور نازک مقامات کو قرآنی آیات اور علمی و منطقی استدلال کے ذریعے حل کرنے کی کام یاب کوشش کی ہے۔ مولانا کی یہی انفرادیت انھیں دوسرے سیرت نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔

مغربی سیرت نگاروں میں ولیم میور سے لے کر مانٹ گمری تک تمام مستشرقین نے سیرت نبوی کو خلط ملط کرنے اور حتی الامکان مضحکہ خیز انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ان مستشرقانہ خیالات نے برعظیم کے سیرت نگاروں کو بھی متاثر کیا ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں مستشرقین کے اعتراضات کا علمی و منطقی جواب دینے کے ساتھ ساتھ واقعات و مسائل کی حقیقی نوعیت اور اس کا اسلامی حل بھی پیش کیا ہے۔

مولانا مودودی نے سیرتِ نبوی کے لیے قرآن حکیم میں سے ایسی آیات کا انتخاب کیا ہے، جن سے سیرتِ نبوی پر کسی نہ کسی زاویے سے روشنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے عربی زبان کی جن مستند اور متداول کتبِ احادیث اور کتبِ سِیَر سے استفادہ و استناد کیا ہے، ان پر سرسری نظر ڈالنے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے کس جاں کاہی، ریاضت اور دِقتِ نظر سے کام لیا ہے۔ ذیل میں اس کی ایک فہرست دی جارہی ہے:

کتبِ احادیث: بخاری، مسلم، مسند احمد، ترمذی، نسائی، بیہقی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارقطنی، حاکم وغیرہ۔

مصنفین کتبِ سِیَر: ابنِ ہشام، ابنِ کثیر، ابنِ ابی حاتم، ابن جریر طبری، امام نووی، ابنِ اسحاق، ابنِ عساکر، ابنِ مردویہ، ابن سعد بلاذری، ابونعیم، بزار، ابوعوانہ وغیرہ۔

سیرتِ سرورِ عالمؐ کے علاوہ مولانا مودودی نے متعدد تاریخی شخصیات، اسلامی اکابر اور مجدّدینِ وقت کی سیرت و شخصیت اور ان کے کارناموں پر طویل اور مختصر مضامین لکھے ہیں۔ ان میں امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام غزالیؒ، امام ابنِ تیمیہؒ، مجددِ الفِ ثانیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر اور مصطفیٰ کامل پاشا پر مقالے اہم اور قابلِ ذکر ہیں۔

اس سے پہلے کہ مولانا مودودی کی شخصیت نگاری پر گفتگو کی جائے، چند باتیں شخصیت نگاری کے تعلق سے عرض کر دینا ضروری ہے:

شخصیت نگاری اور خاکہ نگاری کا فن ایجاز و توازن، حکیمانہ نظر اور گہرے مشاہدات کا طالب ہے۔ یہ ایک مشکل اور ادق فن ہے، جس کے لیے عمیق مطالعے کے ساتھ ساتھ حسن سلیقہ اور جرأتِ حق گوئی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ دراصل سچ لکھنے اور سچ کے سوا کچھ نہ لکھنے کا کام ہے۔ بہت کم ہی شخصیت نگار ہیں جو حق گوئی اور دیانت داری کی میزان پر کھرے اترتے ہوں۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ شخصیت کے اثرات شخصیت نگار پر حاوی نظر آتے ہیں۔

اردو میں شخصیت نگاری کی روایت زیادہ قدیم نہیں ہے۔ شخصیت نگاری کے ابتدائی نمونے اردو کے تذکروں میں مل جاتے ہیں۔ لیکن ان تذکروں میں شعرا و ادبا کے مختصر حالات ہی بیان کیے جاتے ہیں۔ آبِ حیات پہلی کتاب ہے، جس میں شعرا و ادبا کے احوال و کوائف کی تفصیل ملتی ہے، لیکن محمد حسین آزاد، باوجود اپنی شگفتگیِ تحریر اور انشا پردازی کے، جانب داری کا شکار ہو گئے ہیں۔ بہ ہر حال اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ آبِ حیات نے اردو مرقع نگاری پر دیرپا اثرات مرتب کیے ہیں۔ اردو کے مشہور خاکوں میں: فرحت اللہ بیگ 'نذیر احمد کی کہانی' اور 'دلی کا یادگار مشاعرہ'، مولوی عبد الحق 'چند ہم عصر'، رشید احمد صدیقی 'گنج ہائے گراں مایہ'، سعادت حسین منٹو 'گنجے فرشتے' اور 'لاؤڈ اسپیکر'، شاہد احمد دہلوی 'گنجینۂ گوہر' اور 'بزم خوش نفساں'، محمد طفیل 'جناب'، 'صاحب مکرم' اور 'مخدومی'، علی جواد زیدی 'آپ سے ملیے'، آغا شورش کاشمیری 'نورتن'، محی الدین قادری زور 'چند شخصیتیں چند تاثرات'، سید ابو الحسن علی ندوی 'پرانے چراغ'، نصر اللہ خاں 'کیا قافلہ جاتا ہے'، صالحہ عابد حسین 'جانے والوں کی یاد آتی ہے'، شوکت تھانوی 'شیش محل'، اور: ضمیری جعفری 'کتابی چہرے' وغیرہ اہم اور قابل ذکر خاکے ہیں۔ ان میں بعض طویل اور بعض مختصر ہیں۔ بعض میں تاریخ و سیرت کے عناصر حاوی ہیں اور بعض میں شخصی پہلوؤں کو کم اجاگر کیا گیا ہے اور بعض پر خاکہ نگار کی شخصیت کا پرتو ہے۔ ان خاکوں کے اسالیب مختلف ہیں۔ کسی کے یہاں جذباتی و خطیبانہ رنگ غالب ہے اور کسی نے سنجیدہ یا ظریفانہ لہجہ اختیار کیا ہے۔ بہ ہر حال ان میں شخصیتوں کے ظاہر و مخفی گوشوں کو بیان کرنے میں صداقت و دیانت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

مولانا مودودی نے کسی فرد پر اپنا پہلا تجزیاتی مضمون مصطفیٰ کامل پاشا پر لکھا، جو رسالہ نگار کے جون ۱۹۲۴ کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مولانا مودودی کی انشا پردازی اور اسلوب کی پُرکاری کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ ابتدا میں مولانا کے اسلوب کا رنگ کس قدر نمایاں ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> مصطفیٰ کامل سے ہندستان بہت کم واقف ہے اور اہلِ ہند کے کان عموماً اس سے نا آشنا ہیں، مگر ارضِ فراعنہ کے ذرے آج بھی یہ نام سن کر تکبیر و تہلیل کرنے لگتے ہیں۔ آج ۱۶ ربرس کی پر انقلاب مدت گزر جانے کے بعد بھی جب آلِ فراعنہ کے سامنے یہ نام لیا جاتا ہے تو وہ وجد میں آجاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں وہ زمانہ پھر جاتا ہے، جب اس نام کے ایک دبلے پتلے ضعیف الجثہ نوجوان نے اول اول انھیں ہوش کی دوا سنگھائی تھی، جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کیا تھا اور طلبِ استقلال کی کچھ ایسی تند و تیز شراب پلا دی تھی، جس کا نشہ سخت سے سخت ترشیوں کے باوجود آج تک برابر چڑھتا ہی جا رہا ہے۔[۱]

مولانا محمد علی جوہر متحدہ ہندستان کی وہ عظیم شخصیت تھے، جنھوں نے اپنی بے مثال صحافت، منفرد اسلوب، سیاسی افکار اور مجتہدانہ نظر سے بے شمار لوگوں کو متاثر کیا ہے۔ مولانا مودودی اور مولانا جوہر کے مابین برادرانہ تعلقات تھے۔ مولانا مودودی نے ان سے کئی ملاقاتیں کیں اور ایامِ علالت میں بھی ان کے ساتھ رہے۔ ان کی شخصیت کو مولانا نے بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر کی کثیر الجہات شخصیت کو اختصار مگر جامعیت کے ساتھ مولانا نے اپنے مخصوص اسلوب میں کس طرح پیش کیا ہے، ایک اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

> محمد علی کا ساز عیم غلام آباد ہندستان نے شاید کوئی نہیں پیدا کیا۔ وہ گدائے بے نوا تھا لیکن آغا خاں اور مہاراجا محمود آباد اس کے حضور میں جھک کر آتے تھے۔ وہ اقلیت کا ایک فرد تھا لیکن اکثریت کا سب سے بڑا لیڈر ــــــ گاندھی ــــــ اس کی جیب میں تھا اور پٹیل، موتی لال، جواہر لال، راجندر پرشاد وغیرہ تو اس سے دوسرے ہی درجے پر تھے۔ وہ ایک غلام ملک کا باشندہ تھا، لیکن دنیا کی سب سے بڑی سامراجی حکومت اس سے ڈرتی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے انگریزی دور میں کم از کم وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر تو بن ہی سکتا تھا لیکن ان مناصبِ عالیہ پر اس نے کبھی نگاہ غلط

---

(۱) شخصیات، اول، مرتبین: سمیع اللہ، خالد ہمایوں، ص ۱۸۳۔

> انداز ڈالنا بھی گوارا نہ کیا۔ اس کی زندگی کا قصد منہاجِ خلافتِ راشدہ پر خلافت کا قیام تھا۔ وہ پابندی سے نماز پڑھتا تھا، پابندی سے روزے رکھتا تھا اور ذات رسالت مآبؐ سے اس کی عشق اور شیفتگی کی یہ کیفیت تھی کہ ''جب نام ترا لیجیے، تب اشک بھر آوے۔(۱)''

یہ بات درست ہے کہ مولانا مودودی نے الجہاد فی الاسلام جیسی معرکہ آرا کتاب انھی کی تحریک پر لکھی تھی لیکن محمد علی جوہر سے فکری ہم آہنگی، جذباتی عقیدت اور سیاسی معاملات میں اتفاق کے باوجود، مولانا مودودی نے محسوس کیا کہ ''میرا اور ان کا نباہ نہیں ہوسکتا۔ ان کی مہرِ پدر میں جورِ پدر بھی شامل تھا اور وہ بھی پوری شدت اور انتہا پسندی کے ساتھ(۲)'' شاید یہی وجہ ہے کہ جب محمد علی جوہر نے مولانا مودودی کو ہمدرد کا ایڈیٹر بنانا چاہا تو انھوں نے اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے پیشِ نظر اس سے صاف انکار کر دیا تھا۔

علامہ محمد اقبال برعظیم کی عظیم شخصیت، شاعر و ادیب، حکیم و فلسفی اور دانش ور تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری سے ۲۰ویں صدی کے اردو شعر و ادب کو متاثر کیا۔ ان کی سیرت و شخصیت اور اخلاق و کردار نے بے شمار لوگوں کو اپنا اسیر کر لیا تھا۔ علامہ اقبال سے مولانا مودودی کا والہانہ تعلق تھا۔ مولانا انھیں اپنا روحانی سہارا مانتے تھے۔ انھی کے مشورے سے پٹھان کوٹ میں ''ادارہ دارالاسلام'' قائم ہوا، جس نے دین وملت کی مفید خدمات انجام دیں۔ مولانا مودودی اور علامہ محمد اقبال کے افکار و نظریات میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس لیے بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ مولانا مودودی نے وہی کارنامہ نثر میں انجام دیا جو کارنامہ علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے انجام دیا۔ علامہ محمد اقبال سے گہری نسبت کے سبب مولانا نے ان کے متعلق چند مضامین لکھے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں علامہ اقبال کی سیرت و شخصیت کے مختلف پہلوؤں مثلاً: ان کی سادہ زندگی اور فقیرانہ طبیعت، فرنگی سلطنت اور تہذیب مغرب سے نفرت، حبِ رسولؐ، کلامِ الٰہی سے لگاؤ اور شریعت کی پابندی وغیرہ اور ان کے کارناموں میں مثلاً: مغربی تہذیب پر ضرب کاری، وطنیت کی تردید، دین و سیاست کے متعلق باطل تصورات کی بیخ کنی وغیرہ پر نہایت اختصار و

---

(۱) شخصیات، اول، مرتبین: سمیع اللہ، خالد ہمایوں، ص ۲۱۳ - ۲۱۴۔

(۲) ماہ نامہ سیارہ، اپریل مئی ۱۹۸۰، ص ۴۰۸۔

اجمال کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ مولانا نے ادائے مطالب پر زیادہ زور دیا ہے اور نہایت سادہ اور سلیس اسلوب اختیار کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> حقیقت یہ ہے کہ اگر انھوں نے قوم پرستی، نیشنلزم اور وطنی قومیت پر بروقت ضرب کاری نہ لگائی ہوتی تو آگے چل کر مسلمانوں کو کانگریس میں جذب کرنے کے لیے جو تحریک اٹھی تھی، اس سے مسلمانوں کا بچ جانا محال تھا۔ ایسے حالات میں کہ جب علمائے دین تک اٹھ کر مسلمانوں کو وطنی قومیت کا درس دینے لگے تھے اور مسلمانوں کے بڑے بڑے متقی علما تک مسلمانوں سے یہ کہنے لگے تھے کہ وطنی قومیت سے تمھارے دین کو کوئی خطرہ نہیں، اس موقع پر یہ صرف اقبال تھا جس نے پوری شدت کے ساتھ اس تباہ کن تصور کا تار و پود بکھیرا اور لوگوں کو پوری قوت کے ساتھ یہ بتایا کہ وطن بھی ایک بت ہے اور وطن کی پرستش کرنا بھی ویسا ہی شرک ہے جیسا کہ کسی بت کی پرستش کرنا شرک ہے۔ اگر اقبال نے یہ تعلیم بروقت نہ دی ہوتی تو بعد میں کانگریس نے رابطہ عوام (Mass contact) کی جو تحریک شروع کی تھی اور جس میں علما اور اشتراکی حضرات بھی شریک تھے، وہ تحریک مسلمانوں کو ہندوؤں کے اندر اس طرح سے گھلا دیتی جیسے نمک پانی کے اندر گھل جاتا ہے۔[۱]

ان مشاہیر کے علاوہ مولانا مودودی نے عرب و عجم کی نمایاں شخصیتوں اور مجددین اسلام مثلاً: امام حسینؓ، امام ابوحنیفہؒ، عمر بن عبدالعزیزؒ، امام یوسفؒ، امام غزالیؒ، امام ابن تیمیہؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مجدد الف ثانیؒ کے تنقیدی و تعمیری اور تجدیدی کردار کو اجمال اور تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان سب کے علاوہ انھوں نے متعدد شعرا و ادبا اور رہنمایانِ ملت پر بھی مختصر مضامین لکھے ہیں۔

جہاں تک مولانا مودودی کی شخصیت نگاری کا تعلق ہے، انھوں نے جن شخصیتوں پر قلم اٹھایا ہے، نہایت دقتِ نظر، تحقیق و تنقید اور صداقت و دیانت کے ساتھ ان کے کارناموں اور ان کے اثرات کا کہیں اجمال اور کہیں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں کہ شخصیت نگاری کا فن بڑا دقیقہ رسی اور حق گوئی کا طالب ہوتا ہے۔ مولانا مودودی کی شخصیت نگاری کا جائزہ لیا جائے تو ان کی حق بینی و صاف گوئی اور تحقیقی مزاج اور تنقیدی نظر کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

مولانا مودودی نے اپنی مختصر اور نا تمام سوانح بھی لکھی ہے۔ ان کی سوانح نگاری کا جائزہ

---

(۱) شخصیات، ص ۲۳۵۔

لیتے ہوئے، ان کے خودنوشت حالات زندگی کو فراموش کر دینا نامناسب ہوگا۔ مولانا کی اس سوانح عمری کا جائزہ لینے سے قبل چند باتیں خودنوشت سوانح عمری کے تعلق سے توجہ طلب ہیں۔

سوانح عمریوں میں سب سے زیادہ معتبر اور اہم درجہ خودنوشت سوانح عمری کا ہے۔ مصنف کی کہانی مصنف کی زبانی بعض لحاظ سے دل چسپ اور یقیناً مستند ہوتی ہے۔ مصنف کو اپنے ہی حالات و کیفیات اور جذبات و احساسات کے اظہار میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی، اور وہ بہ آسانی اپنے ذہن کی گہرائیوں میں اتر سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کوئی شخص، بغیر خود پسندی اور خودستائی کے، اپنی حدیثِ دل رقم کرسکتا ہے۔ ٹروسوپ کا خیال ہے کہ ''ایک انسان کے لیے بغیر خود پسندی کے، اپنے متعلق گفتگو کرنا مشکل ہے۔(۱)'' شاید یہی وجہ ہے کہ برنارڈ شا نے تمام سوانح عمریوں کو جھوٹ کہا ہے:

> تمام خودنوشت سوانح عمریاں جھوٹی ہیں۔ میری مراد غیر شعوری جھوٹ سے نہیں بلکہ صریح جھوٹ سے ہے۔ کوئی انسان اتنا گیا گزرا نہیں کہ اپنے جیتے جی اپنے متعلق ایسی حقیقت کا اظہار کرے جو لازمی طور پر اس کے خاندان، دوست، احباب اور ساتھیوں کو بھی اپنے لپیٹ میں لیے ہوں۔(۲)

خودنوشت سوانح عمری کی ایک بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں سوانح نگار یا تو اپنی ثناخوانی کرنے میں لگ جاتا ہے، یا پھر اپنے عیوب کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لوگوں کے سامنے لے آتا ہے۔ جوش ملیح آبادی کی یادوں کی برات اور عبدالماجد دریابادی کی آپ بیتی مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ اپنی آپ بیتی میں مولانا دریابادی نے اپنے زمانۂ معاشقہ کو بیان کرنے میں کس درجہ کھلے پن کا ثبوت دیا ہے۔ وہ اپنے آغاز عشق کی روداد یوں بیان کرتے ہیں:

> اب وہ میری مریضہ نہ تھی، ذرا سی دیر میں 'کچھ اور' بن گئی تھی اور معالج اب خشک معالج نہ رہا۔ خود علاج طلب مریض سا بن گیا...... محبت کی ابتدا سے اپنی کیفیاتِ نفس کی ترجمانی سب سے زیادہ مومنؔ اور حسرت موہانی کے کلام میں ملنے لگی اور پھر اس کے بعد عزیز لکھنوی اور مرزا ہادی رسواؔ کے کلام میں۔(۳)

---

(۱) اردو میں سوانح نگاری، سید شاہ علی، ص ۶۹۔

(۲) ایضاً، ص ۶۹۔

(۳) آپ بیتی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ص ۱۶۰، ۱۶۵۔

بہ ہر حال سچی آپ بیتی لکھنا بہت کٹھن ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو میں بہت کم آپ بیتیاں ملتی ہیں اور کام یاب آپ بیتیاں تو بہت ہی کم ہیں۔ اردو کی قابلِ ذکر آپ بیتیوں میں سید ہمایوں مرزا کی میری کہانی، میری زبانی، خواجہ حسن نظامی کی آپ بیتی، مولانا ابوالکلام آزاد کی تذکرہ، حسین احمد مدنی کی نقشِ حیات، یوسف حسین خاں کی یادوں کی دنیا، جوشؔ ملیح آبادی کی یادوں کی برات، کلیم الدین احمد کی اپنی تلاش میں، رشید احمد صدیقی کی آشفتہ بیانی میری، اختر حسین رائے پوری کی گرد راہ، وزیر آغا کی شام کی منڈیر سے، ابوالحسن علی ندوی کی کاروانِ زندگی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی آپ بیتی وغیرہ خودنوشت سوانح کا ایک معیار پیش کرتی ہیں۔ ان میں سے بعض اچھی اور سچی سوانح عمریاں ہیں، بعض سطحی اور مبتذل اور بعض پر سوانح سے زیادہ انشا پردازی کا غلبہ ہے۔

جہاں تک مولانا مودودی کی خودنوشت سوانح عمری کا تعلق ہے، یہ سوانح عمری کے خارجی اور داخلی تقاضوں کو کسی حد تک ضرور پورا کرتی ہے۔ اس میں مولانا مودودی نے خاندانی پس منظر کی تفصیل آغاز ہی میں بیان کردی ہے، اور شجرۂ نسب کی لمبی فہرست، جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہنچتی ہے، ابتدا ہی میں پیش کردی ہے۔ مولانا کی یہ سوانح عمری نہایت مختصر ہے، جس میں ۱۹۳۶ تک کے حالات ہی قلم بند کیے گئے ہیں۔ اس سوانح میں انھوں نے اپنے والد ماجد کے گفتار و کردار اور ذریعۂ معاش، اپنی پیدائش، بچپن کے حالات، تعلیم و تربیت، مدرسے کی زندگی، مضمون نگاری، صحافت، تصنیف و تالیف وغیرہ کے اہم پہلوؤں پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

مولانا مودودی کی اس مختصر سوانح کے مطالعے سے ان کی شخصیت ایک ایسے فرد کے طور پر سامنے آتی ہے، جسے بچپن ہی میں مذہبی ماحول ملا۔ ان کے ابتدائی ایام اکثر و بیش تر اپنے والد اور ان کے احباب (جو سب کے سب تعلیم یافتہ اور سنجیدہ لوگ تھے) کے ساتھ گزری تھی۔ ایامِ طفلی کے مذہبی ماحول نے ان کے قلب و ذہن کو بے حد متاثر کیا۔ مولانا کی زندگی کا یہی وہ تخلیقی دور تھا، جس کے نتیجے میں انھوں نے علمی و مذہبی ادب کو اختیار کیا۔

مولانا مودودی کے ابتدائی علمی و ادبی کارناموں کا سراغ اس آپ بیتی سے بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ان کے مزاج اور میلانات کی کھوج بھی ان کے بچپن کے بعض واقعات سے کی جاسکتی ہے۔ بچپن ہی میں سنجیدگی اور پاکیزگی ان کی طبیعت کا حصہ تھی۔ مختلف فکری و نظری

مباحثوں، تنقیدی شعور اور ادبی ذوق کی بنیادیں بچپن ہی میں رکھی جاچکی تھیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

تحریر وانشا کی طرف میرے فطری میلان کا اظہار سب سے پہلے اس وقت ہوا جب میں نو برس کا تھا۔ اس زمانے میں میرے ایک قریبی عزیز جناب اشفاق احمد زاہدی (صاحب فراست الید) جن کو مضمون نویسی اور کتب بینی کا شوق تھا، اورنگ آباد آئے اور کچھ مدت کے لیے ہمارے ہاں ٹھہرے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ہماری صلاحیت کا امتحان لینے کے لیے کہا کہ اپنے خیال میں یہ سمجھ لو کہ کسی لڑکی پر عاشق ہو گئے ہو اور اپنے اس خیالی معشوق کو خط لکھو، جس میں محبت کے جذبات اور ہجر کی تکالیف کا اظہار ہو۔ یہ ایک ایسا مضمون تھا جس سے ہم بالکل نابلد تھے اور کم از کم میری عمر تو ایسی تھی کہ میرے ذہن میں عشق اور معشوق اور محبت اور ہجر کے تصور کی گنجایش ہی نہ تھی، مگر اس زمانے میں میں گلستاں و بوستاں پڑھ چکا تھا اور اس سے صرف اتنا معلوم گیا تھا کہ عشق کوئی مرض ہے جو کسی اچھی صورت کو دیکھ کر ہو جایا کرتا ہے، اور اس مرض سے دل کے اندر آگ لگ جایا کرتی ہے۔ جو صرف اس کے ملنے ہی سے بجھتی ہے اور جب تک وہ نہ ملے اس وقت تک غریب بیمار جلتا رہتا ہے اور اس حالت کا نام ہجر ہے۔ ان معلومات کو ہم نے اس وقت اپنی بساط کے مطابق خوب استعمال کیا اور ایک لمبا چوڑا خط ان کیفیات کے بیان میں لکھ کر پیش کر دیا۔ اب ہم دونوں میں سے کسی کو یاد نہیں اور نہ بھائی اشفاق کو یاد ہے کہ ہم نے اس وقت کیا لکھا تھا، مگر یہ ضرور یاد ہے کہ وہ ان خطوط کو دیکھ کر پھڑک گئے تھے اور خصوصیت کے ساتھ میرے خط کو انھوں نے زیادہ پسند کیا تھا۔[1]

طبیعت کی اس سنجیدگی اور شایستگی کا اثر ان کی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے۔ خصوصاً ان کے علمی مضامین پر اس کی چھاپ بہ ہر حال واضح دکھائی دیتی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جس وقت مولانا نے یہ سوانح لکھی، وہ علمی و دینی حلقوں میں ایک ممتاز صحافی اور عالم دین کی حیثیت سے معروف ہو چکے تھے۔ اعلیٰ اخلاقی قدروں کی پاس داری، عصری آگہی، دینی و ملی جذبے اور صداقت نگاری ان کے قلم کی پہچان بن گئے تھے، ان کی یہ مختصر آپ بیتی ایک مصلحِ قوم اور عالمِ دین کے ابتدائی حالات ہیں۔

(۱) مولانا مودودی خودنوشت حالات زندگی، مشمولہ: مولانا مودودیؒ اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۳۷۔

مولانا مودودی نے انشا پردازی کے بجائے سادہ لب و لہجے میں صرف اظہارِ حالات پر زور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں رعنائی خیال اور اسلوب کی سحر طرازی نہیں پائی جاتی۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان کے پیشِ نظر باقاعدہ سوانح عمری لکھنا نہیں تھا[۱]۔ بہ ہر حال، مولانا نے یہاں اپنی زندگی کے بعض اہم گوشوں مثلاً ازدواجی زندگی، معاشی مشکلات اور خانگی معاملات وغیرہ سے قصداً صرفِ نظر کیا ہے، اس لیے ان کی اس ''خودنوشت حالات زندگی'' کو نہ تو مکمل سوانح عمری کہا جاسکتا ہے اور نہ اسے آپ بیتی کا درجہ ہی دیا جاسکتا ہے، لیکن صاف گوئی اور صداقت نگاری کے اعتبار سے یہ مختصر حالات، سوانح نگاری کی تاریخ میں ایک معیار قائم کرتے ہیں۔

---

(۱) مولانا مودودی کے بعض ارادت مندوں اور دوستوں نے ان سے آپ بیتی لکھنے کی گزارش کی تھی۔ مولانا نے اس کا یہ جواب لکھا: ''آپ نے اور دوسرے اصحاب نے ازراہِ کرم مجھ سے پرزور تقاضا کیا ہے کہ میں اپنی خودنوشت سوانح لکھوں۔ اس سے پہلے بارہا متعدد اصحاب مجھ سے یہی فرمایش کر چکے ہیں، لیکن میں نے جب کبھی اپنے دل کو ٹٹولا، یہی محسوس کیا کہ اس کام میں مجھے اپنا وقت صرف نہیں کرنا چاہیے۔ میں تقریباً ۴۵ سال سے اپنی زندگی کا ایک نصب العین قرار دے چکا ہوں اور سب کام چھوڑ کر اپنا سارا وقت اور اپنی ساری محنتیں اسی کے لیے وقف کیے ہوئے ہوں۔ مجھے اپنے وقت کے استعمال میں اب اور بھی زیادہ کفایت شعاری برتنی پڑ رہی ہے، کیوں کہ زندگی کے دن تھوڑے ہیں اور اپنے مقصدِ زندگی کے لیے ابھی کام بہت زیادہ کرنا ہے۔ اس حالت میں اپنی سوانحِ حیات لکھنا مجھے اپنے وقت کا کوئی صحیح مصرف نظر نہیں آتا۔ اگر میری زندگی میں کوئی چیز آنے والی نسلوں کی نگاہ میں قابلِ قدر ہوئی تو انھی میں سے کوئی بندۂ خدا اس ضرورت کو پورا کر دے گا اور شاید صحیح سوانح حیات آدمی کے مرنے کے بعد ہی لکھی جاسکتی ہے۔'' (خطوط مودودی، دوم، ص ۵۲۵، ۵۲۶)

ترجمہ نگاری

ترجمہ ایک مستقل فن ہے اور 'یہ نگینہ جڑنے کا فن ہے، جو بڑی مہارت اور ریاضت چاہتا ہے'[۱]۔ ترجمہ علمی و فنی اور تہذیبی و تاریخی لحاظ سے ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اس کے بغیر کسی زبان اور ادب یا قوم اور ملک کی تہذیب و تاریخ سے متعارف ہونے کا تصور محال ہے۔

دنیا کی تمام زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ہرنئی زبان نے قدیم زبانوں کے ترجموں سے نشو و نما اور ترقی پائی ہے اور 'اردو تو باقاعدہ زبان بنی ہی ترجموں کی بہ دولت، ورنہ جب تک وہ کھڑی بولی کے روپ میں تھی، اسے کسی بڑے قلم کار نے ادبی تصنیف کے قابل نہ سمجھا'[۲]۔

کسی نئی یا ترقی پذیر زبان و ادب کے لیے ترقی یافتہ زبانوں کے علوم و فنون سے بہ راہِ راست استفادہ اور راہ نمائی حاصل کرنا بے حد ضروری ہے اور یہ کام ترجمے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے یورپ اور مغرب کے بڑے بڑے ادیبوں اور مفکروں کی تخلیقات کے ترجمے کیے گئے۔ عربی و فارسی اور یونانی و لاطینی زبانوں نے اس ضمن میں مثالیں قائم کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان زبانوں میں دنیا کے مختلف علوم و فنون اور تاریخ و فلسفے کا عظیم سرمایہ محفوظ ہے۔

عملِ ترجمہ کے لیے دولسانی وحدتوں کے درمیان رابطے کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر ترجمہ کارآمد نہیں ہوسکتا۔ دولسانی وحدتوں کے اِرتباط سے نہ صرف الفاظ و معانی کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ علمی و ثقافتی سرمایہ بھی وسیع ہوتا ہے۔ ترجمے کے ذریعے زبانیں تجربہ، تربیت اور خود اعتمادی حاصل کرتی ہیں اور یہی وہ ہتھیار ہے، جس کے زور سے نئی زبانیں ترقی یافتہ زبانوں کی بالادستی کو ختم کرتی ہیں۔

---

(۱) 'ترجمہ کی اہمیت': شہباز حسین، مشمولہ فن ترجمہ نگاری، مرتب: خلیق انجم، ص ۶۲۔

(۲) 'ترجمہ کے بنیادی مسائل': ڈاکٹر ظ۔ انصاری، مشمولہ: ایضاً، ص ۸۰۔

ترجمہ جہاں ایک طرف زبان کے پھلنے پھولنے اور اس کی لسانی ساخت کی تشکیل میں مدد کرتا ہے، وہیں دوسری طرف اس کے توسط سے اظہار و بیان کے لیے نئے اسالیب، نئے محاورے اور نئے محرکات دستیاب ہوتے ہیں اور فکر و تحقیق کے لیے نئے زاویوں کا تعین اور نئی اصناف کے لیے میدان تیار ہوتے ہیں۔ جیلانی کامران کے خیال میں:

> ترجمہ اصل میں دو زبانوں اور دو تہذیبوں کے مابین پل کا کام دیتا ہے، جس کے ذریعے خیالات اور تصورات ایک تہذیب سے دوسری طرف اور ایک ملک سے دوسرے ملک کی جانب جاتے ہیں۔(۱)

لہٰذا، تہذیبی نشو و ارتقا کے لیے ترجمہ ایک لازمی عمل ہے، جس کے ذریعے مختلف جغرافیائی حدود کے اندر انسانی برادری کی عملی سرگرمیوں سے ہم روشناس ہوتے ہیں۔ قوم و ملک اور تہذیب و تاریخ کے اختلاف کے باوجود ترجمے کے وسیلے سے بین الاقوامی انسانیت کی تعمیر کا کام آسان ہو جاتا ہے۔

ترجمے کا عمل بہت حد تک نفیِ ذات کے عمل سے عبارت ہے۔ جب مترجم کسی فن پارے کو ترجمے کے لیے منتخب کر لیتا ہے تو خواستہ نخواستہ وہ اصل متن کا مطیع بن جاتا ہے، اور متن کی حاکمیت کے سبب بسا اوقات مترجم لفظ پر لفظ بٹھانے کے علاوہ کوئی اور جرأت نہیں کر پاتا۔ یہ درست ہے کہ مترجم کو اصل متن کا پابند ہونا چاہیے، مگر یہ اطاعت بہ ذاتِ خود ترجمہ اور مترجم کے لیے مضر ہے، اسی لیے بہترین اور معیاری ترجموں کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی ہے۔ کام یاب ترین ترجمہ وہ ہے جو قاری کو اصل متن سے کلیتاً بے نیاز کر دے۔ لیکن ایسے ترجمے بہت شاذ ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ایک تہذیب کے رموز و حقائق کو دوسری تہذیب میں منتقل کرنا بے حد دشوار کام ہے اور خصوصاً ادبِ عالیہ کا ترجمہ کرنا تو جگر کاوی کا کام ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ایک حل طلب مسئلہ یہ ہے کہ ترجمے کا اصول کیا ہو؟

ترجمے کا بنیادی مقصد کسی زبان کے خیالات و احساسات کو دوسری زبان میں پلٹ دینا نہیں ہے بلکہ اس کے مفہوم کی ادائے گی کرنا ہے۔ اس لیے جس زبان سے اور جس زبان میں ترجمہ کرنا ہے، مترجم کا دونوں پر کامل دسترس رکھنا ضروری ہے۔ دونوں زبانوں کے اصول و قواعد، علامات و اصطلاحات، تشبیہ و استعارات، محاسن و معائب، مقامی لفظیات و متروکات، تراکیب اور اسالیبِ بیان سے مترجم کو بہ خوبی واقف ہونا چاہیے۔

---

(۱) 'ترجمے کی ضرورت'؛ جیلانی کامران، مشمولہ: فن ترجمہ نگاری، ص ۷۵

عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ مترجم منحرف ہوتا ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ مترجم مصنف کی روح سے اکثر انحراف کر جاتا ہے۔ وہ اصل متن کے مفہوم کی ادائے گی میں حذف واضافے کے علاوہ اپنے مخصوص اسلوب کی چھاپ بھی چھوڑ جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ مترجم کو اجتہاد کا حق حاصل ہے لیکن ترجمہ کرتے وقت اسے ہوشیاری اور غایت درجہ احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ مترجم کی بے احتیاطی بسا اوقات ترجمے کو ترجمانی یا تالیف بنا دیتی ہے، اور اکثر ترجمے، تالیف یا ترجمانی ہی ہوتے ہیں۔ بہ ہر حال 'اچھا ترجمہ اسی وقت وجود میں آسکتا ہے جب مترجم نے نیک نیتی کے ساتھ اپنی شخصیت کو کھو کر مصنف کی شخصیت تلاش کرنے کی کوشش کی ہو۔ اپنی ذات کی نفی اور اپنی شخصیت سے انکار ایک اچھے مترجم کے لیے ضروری ہے(۱)'

مختلف علوم وفنون پر ترجمے کی ایک شان دار روایت تاریخ کے اوراق میں ملتی ہے۔ جہاں ایک طرف عرب وعجم کے علما نے یونانی اور ہندستانی فلسفہ وعمرانیات اور ہیئت ونجوم کا عربی میں ترجمہ کر کے اپنے علمی اثاثے میں اضافہ کیا، وہیں دوسری طرف لاطینی ورومی زبان کے ذریعے مشرق کو اور سنسکرت کے ذریعے مغرب کو، نئی تحقیقات سے آشنائی ہوئی۔ والٹیئر نے شیکسپیئر کا ترجمہ کر کے فرانسیسی زبان کے ذخیرے میں اور پسترناک نے روسی زبان کے ادب میں قابلِ قدر اضافے کیے۔ 'اس طرح اس دوطرفہ عمل نے مشرق ومغرب کی طنابیں کھینچ دیں(۲)'

ترجمے کی ایک شان دار روایت جاگیردارانہ حکومتوں کے طویل زمانے میں ملتی ہیں، جس میں دوسری زبانوں سے ترجمے کے لیے ماہرینِ زبان کو مدعو کیا جاتا تھا اور ترجمے کی اشاعت کے لیے سرکاری انتظامات کیے جاتے تھے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ 'اشوک اعظم کے پاٹلی پترا میں، بنی عباس کے بغداد میں، بنو فاطمہ کے قاہرہ اور سکندریہ میں، عہدِ اکبری کے آگرہ میں اور بالآخر نظام کے حیدرآباد میں دارالترجمہ ملتے ہیں(۳)'

مغلیہ سلطنت کے دور میں علم وادب کی بڑی ترقی ہوئی ہے۔ انھیں علم وادب سے خاصی دل چسپی تھی۔ اکبرِ اعظم کو سنسکرت سے خاصا شغف تھا۔ ان کے عہد میں فارسی سے سنسکرت

---

(۱) تنقید اور تجربہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص ۱۲۵۔

(۲) ڈاکٹر ظ۔ انصاری: ''ترجمے کے بنیادی مسائل''، مشمولہ: فن ترجمہ نگاری، ص ۹۷۔

(۳) ڈاکٹر ظ۔ انصاری: 'ترجمے کے بنیادی مسائل'، مشمولہ: فن ترجمہ نگاری، ص ۹۷۔

اور سنسکرت سے فارسی میں فلسفہ، شاعری، ریاضی، تاریخ اور مذہبی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ ان تراجم میں ہندو پنڈت اور مسلم علما برابر کے شریک تھے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ خرد افروز (۱۵۷۴)، اتھرو وید (۱۵۷۵)، رامائن، تاریخ کشمیر (۱۵۸۹) کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ عہد اکبری میں ہی مہا بھارت (۱۵۹۱) کا فارسی ترجمہ علمائے کرام نے کیا۔ لیلاوتی، نل دمن، تاجک اور ہری بنس کے ترجمے بھی اسی زمانے میں تیار ہوئے۔

دوسری ہجری کے وسط میں ہندستان سے باہر بھی ہندستانی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ علم ہیئت کی مشہور کتاب سدھانت کا عربی ترجمہ ابراہیم فرازی نے خلیفہ منصور عباسی کے حکم سے کیا۔ اس کے علاوہ ریاضی اور دوسرے علوم کی کتابوں کا بھی عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ ان میں پنچ تنتر کا عربی ترجمہ کلیلہ ودمنہ بہت مشہور ہوا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے دارالترجمہ عثمانیہ یونی ورسٹی میں قیامِ حیدر آباد (۱۹۳۰ تا ۱۹۳۲) کے دوران، دو عربی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ان میں پہلا ابن خلکان کے ان حصوں کا ترجمہ ہے، جن کا تعلق مصر کے فاطمی خلفا سے ہے۔ دوسرا عربی فلسفے کی ایک ادق کتاب الحکمة المتعالیه فی الاسفار العقلیه کے چار میں سے دو آخری سفروں کا اردو ترجمہ ۱۹۳۲ میں کیا۔ یہ دونوں ترجمہ تلاشِ بسیار کے باوجود بھی دستیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ شاید یہ ترجمے بھی دارالترجمہ کی آتش زنی کی نذر ہو گئے ہوں۔[1]

مذکورہ بالا دو ترجموں کے علاوہ، مولانا مودودی نے ۱۹۱۴ میں قاسم امین بے کی کتاب المرأة الجدیده کا سلیس اور بامحاورہ اردو زبان میں ترجمہ کیا تھا، مگر بدقسمتی سے یہ مسودہ بھی ضائع ہو گیا۔

ترجمے کے باب میں مولانا مودودی کا سب سے اہم اور قابل ذکر کارنامہ قرآن مجید کی ترجمانی ہے، جو بہ قولِ خود 'عربی مبین کی ترجمانی اردوے مبین میں کرنے کی کوشش ہے'۔ مولانا مودودی کے ترجمۂ قرآن مجید کا جائزہ لینے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سے قبل قرآن مجید کے تراجم پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لی جائے۔

قرآن مجید کا اردو میں سب سے پہلا ترجمہ شاہ رفیع الدین صاحب نے کیا۔ یہ قرآن کا لفظی ترجمہ تھا، جس میں سلاست اور روانی نہ ہونے کی وجہ سے قرآن کے اصل مفہوم کو سمجھنا

(۱) ایک جلد کا ترجمہ دستیاب ہو گیا ہے۔ (ر۔ ہاشمی)

بہت مشکل تھا۔ بعدازاں ان کے بھائی شاہ عبدالقادر نے قرآن مجید کا اردو ترجمہ پیش کیا جو ایک قدیم زبان میں لفظی ترجمہ تھا۔ 'یہ ترجمہ مستند ہونے کے باوجود سلیس اور جان دار نہیں تھا(۱)' مولانا محمود حسن اور مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی قرآن کے ترجمے کیے، مگر ان ترجموں میں بھی شاید کچھ کمی رہی۔ حافظ فتح محمد جالندھری نے رواں اور با محاورہ زبان میں قرآن کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی، لیکن بہ کثرت تشریحی قوسین کے استعمال نے قرآن کے ربط و تسلسل کو متاثر کیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمۂ قرآن مجید مقبولِ عام نہ ہوسکا۔ ترجمۂ قرآن مجید کے سلسلے میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے ایک بہتر کوشش کی، لیکن ان کا مخصوص اسلوب ترجمے پر حاوی نظر آتا ہے۔ بہ ہر حال قرآن مجید کے ان تراجم نے قرآن کے معانی و مطالب کو عوام تک پہنچانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ قرآن مجید کے یہ ترجمے قرآنی الفاظ کے معانی تو بیان کر دیتے ہیں اور پڑھنے والا قرآنی آیات کے معانی و مطالب سے کماحقہٗ واقف بھی ہوجاتا ہے، مگر یہ تراجم، قرآن مجید کو ایک مربوط اور منضبط کلام کی حیثیت سے پیش نہیں کرتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس سلسلے میں لائقِ ستایش کوشش کی ہے، مگر ان کا ترجمۂ قرآن مجید نامکمل ہے۔

ترجمہ فی نفسہٖ ایک مشکل فن ہے اور خاص طور پر قرآنِ حکیم کا ترجمہ کرنا تو بے حد مشکل کام ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو میں قرآنِ حکیم کے ترجمے کم ہی ملتے ہیں۔ مارکیٹ میں دستیاب بہت سے ترجمے قرآنی روح کی حقیقی ترجمانی نہیں کر پاتے۔ اس ضمن میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ قرآن کا ترجمہ کیسا ہونا چاہیے؟ لفظی اور بین السطور ترجمہ یا قرآن کے معانی و مفہوم کی ترجمانی؟ لفظی ترجمے کی افادیت یہ ہے کہ قاری، قرآنی الفاظ کے معانی سے آگاہ ہوجاتا ہے، مگر مشکل یہ پیدا ہوجاتی ہے کہ اس طرح کے ترجموں میں فصاحتِ کلام، زورِ بیان اور شدتِ تاثیر کی کمی واقع ہوجاتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ لفظی ترجمے عموماً بین السطور درج ہوتے ہیں، جس کا نقصان یہ ہے کہ پڑھتے وقت قرآنی عبارت کا ربط و تسلسل بکھر جاتا ہے۔

قرآنِ مجید کے ترجمے میں ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کا طرزِ بیان تحریری نہیں بلکہ تقریری ہے، اور تقریری و تحریری اسالیب بیان میں بڑا فرق ہے۔ قرآن کے تقریری اندازِ بیان کو تحریر کے قالب میں ڈھالنے کے لیے حد درجہ کمال اور احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر یہ کہ 'قرآن اگرچہ عربیِ مبین میں نازل ہوا ہے، لیکن اس کے ساتھ وہ اپنی ایک مخصوص

(۱) مولانا مودودی کی ادبی خدمات، پروفیسر عبدالمغنی، ص ۴۳۔

اصطلاحی زبان بھی رکھتا ہے۔ اس نے بہ کثرت الفاظ کو ان کے اصل لغوی معنی سے ہٹا کر ایک خاص معنی میں استعمال کیا ہے اور بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کو وہ مختلف مواقع پر مختلف مفہومات میں استعمال کرتا ہے۔ پابندیِ لفظ کے ساتھ جو ترجمے کیے جاتے ہیں، ان میں اس اصطلاحی زبان کی رعایت کو ملحوظ رکھنا بہت مشکل ہے اور اس کے ملحوظ نہ رہنے سے بسا اوقات ناظرین طرح طرح کی الجھنوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں(۱)'

لفظی ترجمے کی اسی کم زوری کے پیشِ نظر مولانا مودودی نے قرآنی الفاظ کو اردو کا جامہ پہنانے کے بہ جاے آزاد ترجمانی کے طریقے کو اختیار کیا ہے۔

ترجمۂ قرآن مجید کی ابتدا میں مولانا مودودی نے ایک دیباچہ لکھا ہے، جس میں قرآن مجید کے سابقہ ترجموں کی صورتِ حال، دورِ جدید میں ترجمانی کی ضرورت و اہمیت، اپنے طریقۂ ترجمہ اور پابند ترجمے کے بہ جائے آزاد ترجمانی اختیار کرنے کے اسباب کی وضاحت کی ہے اور اپنی اس کوشش کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

> میں نے اس میں قرآن کے الفاظ کو اردو کا جامہ پہنانے کے بہ جاے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کی ایک عبارت کو پڑھ کر جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے دل پر پڑتا ہے، اسے حتی الامکان صحت کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کر دوں۔ اسلوب بیان میں ترجمہ پن نہ ہو، عربِی مبین کی ترجمانی اردوے مبین میں ہو، تقریر کا ربط فطری طریقے سے تحریر کی زبان میں ظاہر ہو اور کلامِ الٰہی کا مطلب و مدعا صاف صاف واضح ہونے کے ساتھ اس کا شاہانہ وقار اور زورِ بیان بھی، جہاں تک بس چلے، ترجمانی میں منعکس ہو جائے۔ اس طرح کے آزاد ترجمے کے لیے یہ تو بہ ہر حال ناگزیر تھا کہ لفظی پابندیوں سے نکل کر اداے مطالب کی جسارت کی جائے لیکن معاملہ کلامِ الٰہی کا تھا، اس لیے میں نے ڈرتے ڈرتے ہی یہ آزادی برتی ہے۔ جس حد تک احتیاط میرے امکان میں تھی، اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے اس امر کا پورا اہتمام کیا ہے کہ قرآن کی اپنی عبارت جتنی آزادیِ بیان کی گنجایش دیتی ہے، اس سے تجاوز نہ ہونے پائے(۲)۔

ترجمۂ قرآن مجید میں مولانا مودودی نے قرآنی آیات کی ترجمانی شستہ و رفتہ اور زندہ

---

(۱) تفہیم القرآن، جلد اول، ص ۱۰۔

(۲) تفہیم القرآن، جلد اول، ص ۱۰، ۱۱۔

اردو زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں حد درجہ احتیاط سے کام لیتے ہوئے، انھوں نے عربِی مبین کی ترجمانی اردوے مبین میں کرنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے محض ترجمے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ساتھ ہی چھے ضخیم جلدوں میں اس کی تفسیر بھی لکھی ہے۔اس لیے قرآن مجید کی ان آیات اور الفاظ و اصطلاحات کے ترجمے، جس میں قرآن کے مترجمین کے درمیان اختلاف رہا ہے، اس کی وضاحت تفہیم القرآن میں کردی گئی ہے۔اس طرح مولانا مودودی کے ترجمے کو ۲۰ویں صدی کی تمام تراجم قرآن پر فوقیت حاصل ہوگئی ہے۔

مولانا مودودی کے ترجمہ قرآن مجید کے محاسن کا اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بعض مقامات کا ان کے دیگر قریب العہد مترجمینِ قرآن مجید کے ساتھ تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ اس کے لیے ہم نے مولانا محمود حسن، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحبان کے ترجموں کا انتخاب کیا ہے۔تقابلی مطالعے کے لیے سب سے پہلے اُمّ القرآن (سورۂ فاتحہ) کا ترجمہ درج کرتے ہیں۔

۱-سورۂ فاتحہ

مولانا محمود حسنؒ

۱- سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو پالنے والا سارے جہان کا۔

۲- بے حد مہربان، نہایت رحم والا۔

۳- مالک روز جزا کا۔

۴- تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔

۵- بتلا ہم کو راہ سیدھی۔

۶- راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا۔

۷- جن پر نہ تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گم راہ ہوئے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ

۱- ہر طرح کی ستایشیں (یعنی حسن و جمال کے اعتراف اور کبریائی و کمال کے اعتقاد کے ساتھ جو کچھ بھی اور جیسا کچھ بھی کہا جائے) صرف اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام کائناتِ خلقت کا پروردگار ہے۔

۲- جو رحمت والا ہے اور جس کی رحمت تمام مخلوقات کو اپنی بخششوں سے مالا مال کر رہی ہے۔
۳- جو جزا اور سزا کے دن کا مالک ہے۔
۴- (خدایا!) ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں صرف تو ہی ہے جس سے (زندگی اور آخرت کی ساری احتیاجوں میں) مدد مانگتے ہیں۔
۵- خدایا! ہم پر (فلاح وسعادت کی) سیدھی راہ کھول دے۔
۶- وہ راہ، جو ان لوگوں کی راہ ہے، جن پر تیرا انعام ہوا۔
۷- ان کی نہیں جو تیرے حضور مغضوب ہوئے اور نہ ان کی جو راہ سے بھٹک گئے اور منزل کا سراغ ان پر گم ہو گیا۔

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

۱- تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے۔
۲- رحمان اور رحیم ہے۔
۳- روز جزا کا مالک ہے۔
۴- ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔
۵- ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔
۶- ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا۔
۷- جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔

اب ذیل میں ہم سورۂ فاتحہ کے بعض الفاظ وآیات کا تقابلی مطالعہ پیش کرتے ہیں:

مولانا محمود حسن صاحب کا ترجمہ، پابند ترجمہ ہے جب کہ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مودودی کا ترجمہ آزاد ترجمہ ہے، جس میں مفہوم کی ادائے گی ہی مقصود ہے۔ مولانا مودودی نے قرآنی الفاظ کے لیے جامع اردو الفاظ اور مترادفات پیش کیے ہیں اور اس کے مفہوم کی ادائی شستہ و رواں اردو زبان میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر مولانا محمود حسن اور مولانا آزاد نے رب العٰلمین میں ''رب'' کا ترجمہ بالترتیب 'پالنے والا' اور 'پروردگار' کیا ہے۔ ''رب'' عربی زبان کا بڑا ہی جامع لفظ ہے، جس کے معنی (۱) مالک اور آقا۔ (۲) مربی، پرورش کرنے والا، خبر گیری اور نگہبانی کرنے والا۔ (۳) فرماں روا، حاکم، مدبر اور منتظم کے ہوتے ہیں۔ محض ''پالنے والا'' (محمود حسن) یا ''پروردگار'' (مولانا آزاد) ''رب'' کے وسیع مفہوم کی ادائی نہیں

کر پاتے۔اسی لیے مولانا مودودی نے ''رب'' کی اسی وسعت و جامعیت کے پیش نظر اس کا کوئی متبادل نہیں پیش کیا ہے۔

اسی طرح الرحمٰن اور الرحیم میں بھی بڑی وسعت و گیرائی ہے۔مولانا محمود حسن نے اس کا لفظی ترجمہ ''بے حد مہربان نہایت رحم والا'' اور مولانا آزاد نے ''جو رحمت والا ہے اور جس کی رحمت تمام مخلوقات کو اپنی بخششوں سے مالا مال کر رہی ہے'' کیا ہے۔مولانا محمود حسن نے اس کے ترجمے میں 'رحمان' اور 'رحیم' کی جامعیت کو نظر انداز کر دیا ہے، جب کہ مولانا آزاد کا ترجمہ طوالت کا شکار ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے اس کی فصاحت و بلاغت مجروح ہو گئی ہے۔رحمان اور رحیم مبالغہ کا صیغہ ہے، جس کے لیے کوئی اردو مترادف نہیں پیش کیا جا سکتا ہے۔مولانا مودودی نے اسے رحمان اور رحیم ہی باقی رکھا ہے، جو زیادہ موزوں اور قرینِ انصاف ہے۔

اھدنا الصراط المستقیم دراصل دعا ہے جو بندہ اپنے رب کے حضور پیش کرتا ہے۔اس کا ترجمہ مولانا محمود حسن نے غیر رفتہ اردو میں کیا ہے اور مولانا آزاد نے قدرے تکلف سے کام لیتے ہوئے اس کے اسلوب کو ثقیل اور بوجھل بنا دیا ہے۔مولانا مودودی نے سادگی سے کام لیتے ہوئے دعائیہ اسلوب کی ترجمانی کی ہے۔

غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کے لیے جو ترجمہ محمود حسن اور مولانا آزاد نے کیا ہے، وہ عامیانہ پن کا شکار ہو گیا ہے۔محض ''غصہ'' یا ''پھٹکار'' اللہ کی شدتِ غضب کو ظاہر کرنے کے لیے موزوں نہیں معلوم ہوتے۔مولانا مودودی نے ''مغضوب'' کا متبادل ''معتوب'' پیش کیا ہے، جو نہ صرف اس شدتِ غضب کو ظاہر کرتی ہے، بلکہ اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے اثرات کا ادراک بھی پیش کرتی ہے۔خالص صوتی اعتبار سے ''مغضوب'' کے لیے ''معتوب'' کا انتخاب حیرت انگیز ہے۔اسی طرح الضالین کے ترجمے ''گم راہ'' سے مطلب تو واضح ہو جاتا ہے، مگر مولانا مودودی کے ترجمے ''بھٹکے ہوئے'' میں سادگی، صفائی اور قطعیت ہے۔

۲- سورۂ رحمٰن (آیات ۵۶ تا ۷۲)

مولانا محمود حسنؒ

۵۶- ان میں عورتیں ہیں، نیچی نگاہ والیاں، نہیں قربت کی ان سے کسی آدمی نے ان سے پہلے اور نہ کسی جن نے۔

۵۷- پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے۔

۵۸- وہ کیسی جیسے لعل اور مونگا۔
۵۹- پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے!
۶۰- اور کیا بدلہ ہے نیکی کا مگر نیکی۔
۶۱- پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے!
۶۲- اور ان دو کے سوا اور دو باغ ہیں۔
۶۳- پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے!
۶۴- گہرے سبز جیسے سیاہ۔
۶۵- پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے!
۶۶- ان میں دو چشمے ہیں ابلتے ہوئے۔
۶۷- پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے!
۶۸- ان میں میوے ہیں اور کھجور اور انار۔
۶۹- پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے!
۷۰- ان سب باغوں میں اچھی عورتیں ہیں خوب صورت۔
۷۱- پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے!
۷۲- 'حوریں ہیں' رُکی رہنے والیاں خیموں میں۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

۵۶- ان میں باحیا حوریں ہوں گی جن کو ان سے پہلے کسی انسان یا جن نے ہاتھ نہیں لگایا ہوگا۔
۵۷- تو تم اپنے رب کی کتنی نوازشوں کو جھٹلاؤ گے؟
۵۸- وہ حوریں ایسی ہوں گی گویا یاقوت اور مونگے ہوں۔
۵۹- تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟
۶۰- نیکی کا صلہ تو آخر احسان ہی ہوگا۔
۶۱- تو تم اپنے رب کے کن کن احسانوں کو جھٹلاؤ گے؟
۶۲- اور ان دو کے سوا اور بھی دو باغ ہوں گے۔
۶۳- تو تم اپنے رب کی کتنی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟
۶۴- دونوں سبزی سے سیاہی مائل۔

۶۵- توتم اپنے رب کی کن کن رحمتوں کو جھٹلاؤ گے؟
۶۶- ان میں دو چشمے ابلتے ہوئے۔
۶۷- تو اپنے رب کی کتنی رحمتوں کو جھٹلاؤ گے؟
۶۸- ان میں میوے، کھجور اور انار ہوں گے۔
۶۹- توتم اپنے رب کی کتنی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟
۷۰- ان میں نیک سیرت اور خوب صورت حوریں ہوں گی۔
۷۱- تو اپنے رب کی کتنی عنایتوں کی تکذیب کرو گے؟
۷۲- حوریں، خیموں میں رہنے والیاں۔

مولانا مودودیؒ

۵۶- ان نعمتوں کے درمیان شرمیلی نگاہوں والیاں ہوں گی جنھیں ان جنتیوں سے پہلے کسی انسان یا جن نے چھوا نہ ہوگا۔
۵۷- اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟
۵۸- ایسی خوب صورت جیسے ہیرے اور موتی۔
۵۹- اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟
۶۰- نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟
۶۱- پھر اے جن وانس! اپنے رب کے کن کن اوصاف حمیدہ کا تم انکار کرو گے؟
۶۲- اور ان دو باغوں کے علاوہ دو باغ اور ہوں گے۔
۶۳- اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟
۶۴- گھنے سرسبز وشاداب باغ۔
۶۵- اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟
۶۶- دونوں باغوں میں دو چشمے فوّاروں کی طرح ابلتے ہوئے۔
۶۷- اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟
۶۸- ان میں بہ کثرت پھل اور کھجوریں اور انار۔
۶۹- اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟
۷۰- ان نعمتوں کے درمیان خوب سیرت اور خوب صورت بیویاں۔

۷۱- اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟
۷۲- خیموں میں ٹھہرائی ہوئی حوریں۔

ان تینوں ترجموں کے تقابلی مطالعے سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱- مولانا مودودی کا ترجمہ قرآنی آیات کی فطری، آسان اور اصل سے قریب ترجمانی ہے مثلاً: فبای آلاء ربکما تکذبٰن میں آلاء کا ترجمہ مولانا محمود حسن صاحب نے لفظی ترجمہ ''نعمتیں'' کیا ہے اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اپنے استاد مولانا حمید الدین فراہی کی اقتدا میں ''نوازشوں''، ''نعمتوں''، ''رحمتوں'' اور ''عنایتوں'' کیا ہے، جب کہ مولانا مودودی نے اس کا ترجمہ اکثر جگہ ''انعامات'' کیا ہے۔ آلاء کے معنی لغت اور تفسیروں میں نعمتوں، قدرتوں، کمالات قدرت اور اوصاف کے بیان ہوئے ہیں۔ اس لیے ''آلاء'' کے ان تمام ترجموں سے اس لفظ کا مفہوم ادا ہوتا ہے، لیکن ''انعامات'' ایک جامع، ہمہ گیر اور وسیع المفہوم لفظ ہے۔ ''انعامات'' کے گھوارے میں مندرجہ بالا تمام معانی کی گنجایش ہے۔

۲- فیھن قصرت الطرف کا ترجمہ مولانا محمود حسن صاحب نے ''ان میں عورتیں ہیں نیچی نگاہوں والیاں'' کیا ہے اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے ''ان میں باحیا حوریں ہوں گی'' کیا، جب کہ مولانا مودودی نے ''اِن نعمتوں کے درمیان شرمیلی نگاہوں والیاں ہوں گی'' کیا ہے۔ ''نیچی نگاہوں والیاں'' اس آیت کے فطری معنی کو واضح نہیں کرتیں اور ''باحیا حوریں'' آیت کے اصل مفہوم کے خلاف ہے۔ اس میں حوروں کا نہیں بلکہ ان عورتوں کا تذکرہ ہے، جو اپنے نیک اعمال کی وجہ سے داخلِ جنت ہوں گی۔ یہی مفہوم مولانا مودودی کے ترجمے سے واضح ہوتا ہے۔

۳- کانھن الیاقوت والمرجان کا ترجمہ ''لعل اور مونگا'' (مولانا محمود حسن) اور ''یاقوت اور مونگے'' (مولانا اصلاحی) میں تکلف صاف نمایاں ہے، جب کہ ''ہیرے اور موتی'' (مولانا مودودی) فطری اور بلیغ ترجمانی ہے۔

۴- مدھامتٰن کا ترجمہ ''گہرے سبز جیسے سیاہ'' (محمود حسن) اور ''سبزی سے سیاہی مائل'' (اصلاحی) میں یکسانیت ہے، جو مدھامتٰن کی اصل کیفیت کی صحیح عکاسی نہیں کرتے،

جب کہ ''گھنے سرسبز وشاداب باغ'' (مولانا مودودی) سے باغِ جنت کی حقیقی اور تجرباتی تصویر آنکھوں کے سامنے اُبھرتی ہے۔

۵- فیھما عینٰن نضاختٰن کا ترجمہ مولانا محمود حسن صاحب نے ''ان میں دو چشمے ہیں ابلتے ہوئے'' اور مولانا امین احسن اصلاحی نے'' ان میں دو چشمے ابلتے ہوئے'' کیا ہے۔ دونوں ترجمے یکساں ہیں۔ مولانا مودودی نے اس کا ترجمہ ''فواروں کی طرح اُبلتے ہوئے'' کرکے ان چشموں میں روح ڈال دی ہے اور یہ ترجمہ ٹھیک وہی تصویر پیش کرتا ہے، جس کا تجربہ ومشاہدہ ہمیں دنیا کے پارکوں اور باغوں سے حاصل ہوتا ہے۔

۶- حور مقصورات فی الخیام کا ترجمہ مولانا محمود حسن نے ''حوریں ہیں، رُکی رہنے والیاں خیموں میں'' اور مولانا اصلاحی نے'' حوریں، خیموں میں رہنے والیاں'' کیا ہے، جب کہ مولانا مودودی نے اس کا ترجمہ ''خیموں میں ٹھیرائی ہوئی حوریں'' کیا ہے۔ اول الذکر دونوں ترجموں سے اس بات کا پتا نہیں چلتا ہے کہ یہ حوریں آخر کس کے لیے بنائی گئی ہیں، جب کہ آخر الذکر ترجمہ ''ٹھیرائی ہوئی حوریں'' میں ٹھیرایا جانا ایک مخصوص معنی دیتا ہے کہ یہ اہل جنت کے استفادے کے لیے خیموں میں ٹھیرائی گئی ہوں گی اور جب اہلِ جنت اپنے قصروں سے سیر وتفریح کے لیے نکلیں گے تو یہ حوریں ان کی دل بستگی کا سامان کریں گی۔

مولانا مودودی کے اسلوبِ ترجمہ سے مزید متعارف ہونے کے لیے دو اور مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔ ایک سورۂ یوسف کی چند آیات اور دوسرے سورۂ انعام کی دو آیات۔ ان میں دونوں سورتوں کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کہ ان میں اول الذکر اپنے مخصوص قصہ پن اور افسانوی طرزِ بیان کے باعث اور مؤخر الذکر اپنے رواں اسلوب کی وجہ سے قرآنی اسالیب میں خاص مقام رکھتی ہیں۔

۳- سورۂ یوسف (آیات ۲۳ تا ۲۶)

مولانا محمود حسن

اور پھسلایا اس کو اس عورت نے جس کے گھر میں تھا، اپنا جی تھامنے سے اور بند کر دیے دروازے اور بولی: شتابی کر، کہا: خدا کی پناہ، وہ عزیز مالک ہے میرا، اچھی طرح رکھا ہے مجھ کو۔ بے شک بھلائی نہیں پاتے جو لوگ کہ بے انصاف ہوں۔ اور البتہ عورت نے فکر کیا اس کا اور اس

نے فکر کیا عورت کا، اگر نہ ہوتا یہ کہ دیکھے قدرت اپنے رب کی۔ یوں ہی ہوا تا کہ ہٹائیں ہم اس سے برائی اور بے حیائی۔ البتہ وہ ہے ہمارے برگزیدہ بندوں میں۔ اور دونوں دوڑے دروازے کو، اور عورت نے چیر ڈالا اس کا کرتا پیچھے سے اور دونوں مل گئے عورت کے خاوند سے دروازے کے پاس۔ بولی: اور کچھ سزا نہیں ایسے شخص کی جو چاہے تیرے گھر میں برائی مگر یہی کہ قید میں ڈالا جائے یا عذابِ دردناک۔ یوسف بولا: اسی نے خواہش کی مجھ سے کہ نہ تھاموں اپنے جی کو۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ

اور (پھر ایسا ہوا کہ) جس عورت کے گھر میں یوسف رہتا تھا (یعنی عزیز کی بیوی) وہ اس پر (ریجھ گئی اور) ڈورے ڈالنے لگی کہ بے قابو ہو کر بات مان جائے۔ اس نے (ایک دن) دروازے بند کر دیے اور بولی: ''لو آؤ''۔ یوسف نے کہا: ''معاذ اللہ! (مجھ سے ایسی بات کبھی نہیں ہوسکتی) تیرا شوہر میرا آقا ہے۔ اس نے مجھے عزت کے ساتھ (گھر میں) جگہ دی۔ (میں اس کی امانت میں خیانت نہیں کروں گا) اور حد سے گزرنے والے کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔'' اور حقیقت یہ ہے کہ عورت یوسف کے پیچھے پڑ چکی تھی اور (حالت ایسی ہوگئی تھی کہ بے قابو ہوکر) یوسف بھی اس کی طرف متوجہ ہو جاتا، اگر اس کے پروردگار کی دلیل اس کے سامنے نہ آگئی ہوتی۔ (تو دیکھو؟) اس طرح (ہم نے نفس انسانی کی اس سخت آزمایش میں بھی اسے دلیل حق کے ذریعے ہشیار رکھا) تاکہ برائی اور بے حیائی کی باتیں اس سے دور رکھیں۔ بلاشبہ وہ ہمارے ان بندوں میں سے تھا جو برگزیدگی کے لیے چن لیے گئے۔ اور (ایسا ہوا کہ) دونوں دروازے کی طرف دوڑے، اس طرح کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ (یوسف اس لیے کہ عورت سے بھاگ نکلے، عورت اس لیے کہ اسے نکل بھاگنے سے روکے)۔ اور عورت نے یوسف کا کرتا پیچھے سے کھینچا اور دو ٹکڑے کر دیا۔ اور (پھر اچانک) دونوں نے دیکھا کہ عورت کا خاوند دروازے کے پاس کھڑا ہے۔ تب عورت نے (اپنا جرم چھپانے کے لیے فوراً بات بنالی اور) کہا: ''جو آدمی تیرے اہلِ خانہ کے ساتھ بری بات کا ارادہ کرے اس کی سزا کیا ہونی چاہیے؟ کیا یہی نہیں ہونی چاہیے کہ اسے قید میں ڈالا جائے یا (کوئی اور) دردناک سزا دی جائے؟ (اس پر) یوسف نے کہا: ''خود اسی نے مجھ پر ڈورے ڈالے اور مجبور کیا کہ پھسل پڑوں'' (میں نے ہرگز ایسا نہیں کیا)۔

مولانا مودودیؒ

جس عورت کے گھر میں وہ تھا وہ اس پر ڈورے ڈالنے لگی اور ایک روز دروازے بند کر کے بولی: "آجا"۔ یوسف نے کہا: "خدا کی پناہ! میرے رب نے مجھے اچھی منزلت بخشی (اور میں یہ کام کروں!) ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے۔" وہ اس کی طرف بڑھی اور یوسف بھی اس کی طرف بڑھتا، اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا۔ ایسا ہوا، تا کہ ہم اس سے بدی اور بے حیائی کو دور کر دیں۔ درحقیقت وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا۔ آخر کار، یوسف اور وہ، آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگے اور اس نے پیچھے سے یوسف کا قمیص (کھینچ کر) پھاڑ دیا۔ دروازے پر دونوں نے اس کے شوہر کو موجود پایا۔ اسے دیکھتے ہی عورت کہنے لگی: "کیا سزا ہے اس شخص کی جو تیری گھر والی پر نیت خراب کرے؟ اس کے سوا اور کیا سزا ہو سکتی ہے کہ وہ قید کیا جائے یا اسے سخت عذاب دیا جائے؟" یوسف نے کہا: "یہی مجھے پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی۔"

مندرجہ بالا تینوں ترجموں سے درج ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

۱- مولانا محمود حسن صاحب کا ترجمہ جو ایک پابند ترجمہ ہے، اس میں ربطِ آیات اور روانی و تسلسل کی کمی صاف نمایاں ہے۔ بیان قصہ کے لیے یہ اسلوب ناقص اور ناموزوں ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی ترجمانی میں قوسین کی بھرمار اور زوائد نے خواہ مخواہ بات کو طویل کر دیا ہے۔ قوسین کا بہ کثرت استعمال، قرآن کے اسلوبِ خاص، ایجاز و اختصار اور اجمال کو مجروح کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس، مولانا مودودی نے بلا تکلف حشو و زوائد کے اس قصے کو سادہ و شیریں اور بامحاورہ اردو میں بیان کیا ہے۔

۲- مولانا محمود حسن نے اس قصے میں ایک جگہ ترجمہ کیا ہے: "اور عورت نے چیر ڈالا اس کا کرتا پیچھے سے" اور مولانا آزاد نے اس کا ترجمہ "عورت نے یوسف کا کرتا پیچھے سے کھینچا اور دو ٹکڑے کر دیا" کیا ہے۔ کپڑے کے سلسلے میں 'چیرنے' اور 'ٹکڑا کرنے' کے لفظ کا استعمال اردو قواعد کے خلاف ہے۔ اس کے برعکس، کپڑے کے لیے 'پھاڑنے' کا استعمال اردو قواعد کے اعتبار سے موزوں اور مناسب ہے، جو مولانا مودودی کے ترجمے میں ملتا ہے۔

۳- اراد باھلک سوء کا ترجمہ مولانا محمود حسن صاحب نے "جو چاہے تیرے گھر میں برائی" اور مولانا آزاد نے "جو آدمی تیرے اہلِ خانہ کے ساتھ بری بات کا ارادہ کرے" کیا ہے۔ مولانا مودودی نے اس کا ترجمہ "تیرے گھر والی پر نیت خراب کرے" کیا ہے۔ اول الذکر

دونوں ترجمے آیت کے شدتِ معنی کو بیان کرنے سے قاصر ہیں، جب کہ مولانا مودودی نے محاورہ ''نیت خراب کرے'' کا برمحل استعمال کر کے جملے کو معنی خیز بنا دیا ہے۔ ساتھ ہی، اھلک کے لیے کھڑی بولی کے لفظ ''گھر والی'' کا استعمال اسے خالص ہندستانی ترجمہ بنا دیا ہے۔

۴- مولانا محمود حسن صاحب اور مولانا آزاد نے رب کا ترجمہ ''آقا'' یعنی عزیزِ مصر کیا ہے، جب کہ مولانا مودودی نے حسب سابق اس کا ترجمہ ''رب'' ہی رکھا ہے۔ قصے کے سیاق و سباق کو سامنے رکھا جائے اور اول الذکر ترجموں کی موزونیت کو پرکھا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ ایک برگزیدہ نبی کی شان کے خلاف ہے کہ وہ گناہ سے باز رہنے میں اللہ تعالیٰ کے بہ جائے کسی بندے کا لحاظ کرے۔ یہاں مولانا محمود حسن اور مولانا آزاد نے سخت ٹھوکر کھائی ہے اور ناقابل بیان تسامح کیا ہے۔

۵- ان آیات میں مولانا مودودی نے بعض الفاظ کے برمحل، بامحاورہ اور کھڑی بولی میں بولتا ترجمہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر راودتہ کے لیے ''ڈورے ڈالنے لگی''، احسن مثوی کے لیے ''اچھی منزلت بخشی''، من عبادنا المخلصین کا ترجمہ ''چنے ہوئے بندوں میں''، ارادتہ باھلک کے لیے ''گھر والی پر نیت خراب کرے'' اور ھی راودتنی کا ترجمہ ''یہی مجھے پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی۔'' موزوں، برمحل، رواں اور بے ساختہ ترجمے کی عمدہ مثال ہے۔

۴- سورۂ انعام (آیت ۱۲۲ تا ۱۲۳)

مولانا محمود حسنؒ

بھلا ایک شخص جو کہ مردہ تھا، پھر ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور ہم نے اس کو دی روشنی کہ لیے پھرتا ہے اس کو لوگوں میں، برابر ہو سکتا ہے اس کے کہ جس کا حال یہ ہے کہ پڑا ہے اندھیروں میں، وہاں سے نکل نہیں سکتا۔ اسی طرح مزین کر دیے گئے کافروں کی نگاہ میں ان کے کام۔ اور اسی طرح کیے ہیں ہم نے ہر بستی میں گناہ گاروں کے سردار، کہ حیلے کیا کریں وہاں۔ اور جو حیلے کرتے ہیں سو اپنی ہی جان پر اور نہیں سوچتے۔

مولانا آزاد

پھر کیا وہ آدمی کہ مردہ تھا، اور ہم نے اسے زندہ کر دیا، اور اس کے لیے ایک نور ٹھیرا دیا کہ اس کے اجالے میں لوگوں کے درمیان (بے کھٹکے) چلے پھرے، اس آدمی جیسا ہو سکتا ہے

جس کا حال یہ ہو کہ اندھیریوں میں گھرا ہوا ہے اور ان سے باہر نکلنے والا نہیں؟ (کبھی نہیں، سو دیکھو: جس طرح ایک شخص باوجود اندھیریوں میں گھرے ہونے کے، اپنی حالت پر قانع ہو جاتا ہے)۔ اسی طرح کافروں کی نظروں میں وہی باتیں خوش نما دکھائی دیتی ہیں جو وہ کرتے رہتے ہیں۔ اور (دیکھو: جس طرح آج مکہ کے رئیس دعوتِ حق کی مخالفت میں سرگرم ہیں) اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بدکردار آدمیوں کے سردار بنا دیے، تا کہ وہاں مکروفریب کے جال پھیلائیں (یعنی ہمارے ٹھیرائے ہوئے قانون کے مطابق جمعیت بشری کی حالت ایسی واقع ہوئی ہے) اور فی الحقیقت وہ مکروفریب نہیں کرتے مگر اپنے ہی ساتھ، لیکن اس کا شعور نہیں رکھتے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

کیا وہ جو مردہ تھا تو ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور ہم نے اس کو ایک روشنی بخشی جس کو لے کر وہ لوگوں میں چلتا ہے، اس کے مانند ہوگا جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہے، ان سے نکلنے والا نہیں ہے؟ اسی طرح کافروں کی نظر میں ان کے اعمال کھبا دیے گئے ہیں اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے سرغنوں کو ڈھیل دی کہ اس میں اپنی چالیں چل لیں اور چال وہ اپنے ہی ساتھ چلتے تھے، لیکن ان کو اس کا احساس نہیں تھا۔

مولانا مودودیؒ

کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی، جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے، اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح ان سے نہ نکلتا ہو؟ کافروں کے لیے تو اسی طرح ان کے اعمال خوش نما بنا دیے گئے ہیں اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا کہ وہاں اپنے مکروفریب کا جال پھیلائیں۔ دراصل وہ اپنے فریب میں آپ پھنستے ہیں مگر انھیں اس کا شعور نہیں ہے۔

مندرجہ بالا چاروں تراجم میں ایجاز واختصار کے اعتبار سے مولانا مودودیؒ کا ترجمہ باقی تینوں ترجموں سے بہ درجہا بہتر اور قریب الاصل ہے۔ مولانا مودودیؒ نے مولانا محمود حسنؒ اور مولانا آزادؒ کے علی الرغم ''ظلمت'' اور ''نور'' کے بہ جاے ''تاریکیوں اور روشنی'' جیسے شایستہ و رفتہ الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ہے کہ مولانا محمود حسن کے یہاں معانی

کی بے ربطی اور تسلسل کی کمی ہے اور مولانا آزاد کی اس عبارت میں بھی قوسین کی کثرت ہے۔ اس کے برعکس محولہ بالا اقتباس میں مولانا مودودی نے قوسین کا سہارا نہیں لیا ہے۔

اکبر مجرمیھا کے ترجمے میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ مولانا محمود حسن اس کا ترجمہ: ''گنہ گاروں کے سردار'' مولانا آزاد ''مفسدوں کا سردار'' اور امین احسن اصلاحی ''برائی کے سرغنوں'' کرتے ہیں، جب کہ مولانا مودودی نے اس کا موزوں، جامع اور تخلیقی ترجمہ ''بڑے بڑے مجرموں'' کیا ہے۔ لفظ 'مجرمین' میں گناہ وفساد اور ہر برائی کے معانی کی گنجایش ہے۔

مولانا مودودی کے مذکورہ اقتباس میں سلاست و شگفتگی اور سادگی و پرکاری کی انتہا ہے، مگر سنجیدگی ہر جگہ برقرار ہے۔ صاف وصریح اور پرتاثیر طرزِ اظہار کی وجہ سے عبارت میں تخلیقیت اور روانی پیدا ہوگئی ہے۔ یہ عبارت عربی الفاظ کی ثروت اردوے مبین میں منتقل کرنے کی عمدہ مثال ہے۔

مختصر یہ کہ مولانا مودودی نے قرآن مجید کے ترجمے میں قرآنی اسلوب کو ایجاز واختصار اور جامعیت کے ساتھ جدید اردو بلکہ اردوے مبین میں منتقل کرنے کی کام یاب کوشش کی ہے۔ مولانا مودودی کا ترجمۂ قرآن مجید کے اردو تراجم کی تاریخ میں اپنے مخصوص اسلوب کے باعث ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا مودودی کے اسلوبِ ترجمہ کا ذکر کرتے ہوئے ممتاز محقق اور نقاد پروفیسر عبدالمغنی نے بجا طور پر لکھا ہے: 'اس کی فصاحت و بلاغت، سلاست و نفاست، لطافت و دبازت اور پختگی و شگفتگی اردو کے نثری ادب میں بے نظیر ہے(۱)'

---

(۱) مولانا مودودی کی ادبی خدمات، ص ۳۸۔

تفسیر نگاری

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا اہم ترین علمی وادبی کارنامہ ان کی تفسیر تفہیم القرآن ہے، جو ان کی دقّتِ نظر، وسعتِ مطالعہ، قرآن فہمی، تدبر فی الآیات اور اجتہادی نظر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ یہ ایک متداول تفسیر ہے، جو برِ عظیم کے اردو خواں طبقات میں نہایت مقبول ومعروف ہے۔ دنیا کی متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں اور اردو میں اشاعت کا اس نے ریکارڈ قائم کیا ہے۔ مولانا مودودی نے اگرچہ بعض علما سے بعض قدیم علوم کا درس لیا تھا، مگر وہ کسی مدرسے کے فارغ التحصیل نہ تھے، اس کے باوجود تفسیر قرآن کا عدیم المثال کارنامہ انجام دینا بفضلِ ربی ان کی خداداد ذہانت، دقیقہ رس شخصیت اور بے مثال مشق وریاض ہی کا ثمرہ ہے۔ مولانا مودودیؒ کی تفسیری خدمات کی قدر وقیمت متعین کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علم تفسیر اور اردو میں تفسیر نگاری کی روایت کا اجمالی جائزہ لے لیا جائے۔

علمِ تفسیر اشرف العلوم ہے، جس کی غرض وغایت قرآن کے مفاہیم سے واقفیت اور احکامِ شرعیہ کا استنباط ہے۔ زرکشی کے نزدیک تفسیر وہ علم ہے جس کے ذریعے اللہ کی کتاب، جو کہ نبی ﷺ پر نازل ہوئی، اس کے مطالب، اس کے احکام اور اس کی حکمت سمجھی جا سکتی ہے۔ اہلِ عرب کو عربیِ مبین کے مفردات، جملوں کے معانی، اعراب اور بلاغت ونحو پر ملکہ حاصل تھا، تاہم (ہر قوم کی طرح) ان کا ذہنی افق بھی ایک سطح اور معیار کا نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کے مشکل مقامات اور مغلق آیات کی توضیح وتشریح کے لیے صحابۂ کرام، رسول اکرم ﷺ سے رجوع کرتے تھے۔ اس علمی ضرورت کے پیش نظر تفسیر نگاری کی بنیاد ڈالی گئی اور پھر اصولِ تفسیر

وضع کیے گئے۔ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کرنے کو بہتر سمجھا گیا، اور جب تفسیرِ قرآن کے سلسلے میں قرآن مجید سے کوئی ہدایت نہ ملنے کی صورت میں سنت، فہمِ تام کے مالک صحابہ کے اقوال، تابعین اور پھر تبع تابعین علما کی تفسیر کو معتمد اور مستند تسلیم کیا گیا۔ علمِ صحیح کے بغیر تفسیر کو فساد اور تضاد کا موجب قرار دیا گیا اور اجماع کو خبرِ واحد پر فوقیت دی گئی۔

تفسیر نگاری کی تاریخ میں دو طرح کی تفسیریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ایک تفسیر بالروایت یا تفسیر ماثور اور دوسری تفسیر بالرائے۔ تفسیر بالروایت کے حامیوں کا موقف یہ تھا کہ قرآن مجید کی تفسیر جس علم کی متقاضی ہے وہ صرف احادیثِ نبوی، آثارِ صحابہؓ اور اقوالِ تابعین پر منحصر ہے۔ جہاں تک تفسیر قرآن کے بارے میں احادیثِ نبوی کا تعلق ہے، حضرت عائشہؓ کے مطابق ان کی تعداد بہت ہی کم ہے، لیکن تفسیرِ قرآن کے لیے محض احادیثِ نبوی، آثار و اقوالِ صحابہ اور تابعین پر انحصار کرنا کافی نہیں ہے، جیسا کہ امام راغب اصفہانی کا خیال ہے کہ جو لوگ اس سلسلے میں صرف روایات پر انحصار کرتے ہیں، وہ یقیناً تفسیر کے ایک بڑے حصے کو چھوڑ دیتے ہیں۔

تفسیر کی دوسری قسم تفسیر بالرائے کے علم برداروں کا خیال ہے کہ خود قرآن نے اہلِ علم کی صلاحیتِ استنباط کی تعریف کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام کو تدبرِ قرآن کی تلقین فرماتے تھے اور تعبیر بہتر ہونے کی صورت میں آپؐ اس کی تائید بھی کرتے تھے۔ آپؐ نے حضرت ابن عباسؓ کے حق میں دعا بھی فرمائی تھی کہ اے اللہ! اسے دین کا صحیح فہم اور آیات کی تعبیر و تاویل کا علم عطا کر۔ بہ ہر حال تفسیر بالروایت اور تفسیر بالرائے دونوں مکاتبِ فکر کی کاوشوں سے دنیا کی ہر بڑی اور متمدن زبان میں اب تک قرآن حکیم کی ہزاروں تفسیریں لکھی گئی ہیں۔

تفسیر کا اسلوب مختلف ادوار میں معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی ارتقا سے متاثر رہا ہے۔ ابتدا میں صرف چند آیات، الفاظ اور واقعات کی تفسیر آسان اور سادہ طریقے سے کی جاتی تھی۔ تفسیر کے دوسرے دور میں منقول روایات اور قصے لکھے گئے، جو اسبابِ نزول اور احکام کے واقعات پر مبنی ہوتے تھے۔ اس اسلوب یعنی تفسیر بالروایت پر متعدد تفسیریں لکھی گئیں جن میں سب سے اہم امام محمد بن جریر طبری کی تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن ہے۔ بعض لوگوں نے ان کی تفسیر پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں معتزلہ کے افکار پائے جاتے ہیں، لیکن بہ ہر حال طبری کی یہ تفسیر ایک قابلِ قدر کارنامہ ہے۔

اہلِ عرب کے روابط جب یونان اور ایران سے قائم ہوئے تو جہاں ایک طرف عقائدی آرا اور مسائل پر استدراک کیا گیا، وہیں فلسفیانہ نظریات بھی تفسیروں میں بیان کیے جانے لگے۔ بعض مفسرین نے فقہی مباحث اور کلامی نقطۂ نظر کو پیش کیا اور بعض ماہرینِ لغت نے اپنی توجہ بلاغت، لغوی توجیہات اور نحوی استعمالات پر مرکوز رکھی۔ دورِ جدید کے مفسرین کا عام رجحان سائنسی تحقیقات اور جدید علمی و تاریخی انکشافات، سماجی و معاشرتی قوانین اور نفسیاتی اسالیب کے مطابق قرآن کی تفسیر کرنے کی طرف بڑھ رہا ہے۔

قرآن کریم کے اردو تراجم و تفاسیر کے سلسلے میں حتمی طور پر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ سب سے قدیم ترجمہ یا تفسیر کون سی ہے، تاہم، مولوی عبدالحق صاحب نے قدیم اردو میں سورۂ یوسف کے گجراتی اردو میں ترجمے کو سب سے قدیم قرار دیا ہے[۱] جب کہ ڈاکٹر حمید شطاری کا خیال ہے کہ عم یتساء لون کا ترجمہ اردو کا قدیم ترین ترجمہ ہے، جس کے ساتھ کہیں کہیں مختصر تفسیر بھی ہے، البتہ اس ترجمے سے، جو ایک ناقص الاول اور ناقص الآخر مخطوطے کی شکل میں ہے، یہ پتا نہیں چلتا کہ اس کا مفسر و مترجم کون ہے[۲]

ابتدائی دور کی دیگر نامکمل تفاسیر میں سورۂ یوسف کی تفسیر، تفسیر حسینی، تفسیر قرآن مجید از سورۂ مریم تا آخر، تفسیر پارہ وَمَا اُبرّیءُ اور تفسیرِ قرآن (شاہ مخدوم حسینی) وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے، جب کہ شمالی ہند کی تفاسیر میں سورۂ بنی اسرائیل و کہف (تفسیر پارہ سبحان الذی) خدائی نعمت (معروف بہ تفسیر مرادی)، تفسیر القرآن (سرسید احمد خاں)، تفسیر ترجمان القرآن بلطائف البیان (نواب صدیق حسن خاں)، تفسیر فتح المنّان مشہور بہ تفسیر حقّانی (ابو محمد عبدالحق دہلوی)، ترجمۃ القرآن (ڈپٹی نذیر احمد)، تفسیر بیان القرآن اور کنز الایمان (احمد رضا خاں بریلوی) کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

دکنی تفاسیر میں تفسیر کے ضمن میں خاطر خواہ کارنامے مفقود نظر آتے ہیں، البتہ اردو نثر کے ابتدائی اسالیب اور اردو کے لسانی ارتقا کے باب میں ان کی تاریخی حیثیت سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔

---

(۱) قدیم اردو، مولوی عبدالحق، ص ۲۲۱۔

(۲) قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ، ۱۹۱۴ تک، ڈاکٹر حمید شطاری، ص ۱۴۱۔

سر سید احمد خان کی تفسیر القرآن (۱۷ ویں پارے تک) اس دور کی عقلیت پرستی کی ترجمان ہے۔ انھوں نے قرآن کے بعض مقامات کو بائبل کے قصوں سے تطبیق کرنے کی جرأت کی ہے اور بعض آیاتِ مقدسہ کی مضحکہ خیز تاویلیں بھی کی ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالی نے سید و مرشد کی اس فاش غلطی کی نشان دہی کرتے ہوئے حیاتِ جاوید میں ایک تنقیدی نوٹ لکھا ہے: 'سر سید نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض بعض مقامات پر ان سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں(۱)' بہر حال سر سید کی یہ کوشش لائق تحسین ہے کہ انھوں نے زمانۂ حال کے مطابق تاریخی و جغرافیائی تحقیقات کو منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن علما کی ضرورت اور فارغ التحصیل طلبہ کے مطالعے کے لیے لکھی گئی تھی۔ ظاہر ہے، اس کے لیے کتابی زبان اختیار کرنا ایک فطری امر تھا۔ مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ کی تفسیر قرآنی آیات کو ایک مخصوص گروہ ''اہل سنت والجماعت'' کی فکر سے منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ قرآن مجید کی یہ مسلکی تفسیر و تعبیر اسے ایک مخصوص نقطۂ نظر کی تفسیر بنا دیتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر قرآن مجید ترجمان القرآن (۱۸ ویں پارے تک) دراصل دورِ جدید کی سائنسی ایجادات اور نظریاتی کش مکش کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ دانش وراور جدید تعلیم یافتہ افراد کے لیے لکھی گئی یہ ایک نامکمل مگر ایک اہم تفسیر ہے۔ انھوں نے جہاں ایک طرف بعض آیات و اصطلاحاتِ قرآنی کی ناتمام تفہیم و تشریح کی ہے وہیں دوسری طرف اس کی تفسیر و تعبیر میں سخت ٹھوکریں بھی کھائی ہیں۔ وہ ایک طرف ڈارون کے نظریۂ ارتقا سے متاثر ہیں تو دوسری طرف اشتراکیت کو ایک نظام زندگی تسلیم کرتے ہوئے اسے ایک موقع بھی دینا چاہتے ہیں۔

علامہ حمید الدین فراہی کو ایک طبقہ قرآن اور علوم قرآن کا ماہر باور کرتا ہے، لیکن انھوں نے فقط پارہ عم کی چودہ (۱۴) سورتوں کی تفسیر نظام القرآن کے نام سے لکھی ہے۔ نظمِ قرآن اور ترتیبِ قرآن کے باب میں ان کی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا، مگر ان کی تفسیر کو تسامحات سے پاک بھی نہیں کہا جا سکتا۔

---

(۱) حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، ص ۲۲۲۔

قرآن مجید کی تفسیری روایت کے اس پس منظر میں مولانا مودودی نے تفسیر تفہیم القرآن لکھی ہے۔ انھوں نے قرآن حکیم کی تفسیر و ترجمانی کے کام کا آغاز تشکیلِ جماعت، ۲۶/اگست ۱۹۴۱ کے چھے ماہ بعد فروری ۱۹۴۲ میں کیا، جس کے اجزا رسالہ ترجمان القرآن میں تواتر سے شائع ہوتے رہے۔ اس کی تکمیل میں انھیں ۳۰ برس کی مسلسل جان کاہ محنت و کاوش کرنی پڑی۔ ان ۳۰ برسوں میں انھوں نے متعدد بار قید و بند اور بیماری کی صعوبتیں برداشت کیں، بیرونی ممالک کے دورے اور خصوصاً ۱۹۵۹ میں ارض القرآن کا عظیم مقصدی سفر بھی کیا اور تحریکِ اسلامی کی امارت کی ذمہ داری نبھاتے ہوئے ملکی سیاست میں بھی سرگرم رہے۔ ان تمام ہنگامہ خیزیوں کے باوجود تفہیم القرآن جیسی عظیم تفسیر کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے، ورنہ تاریخ شاہد ہے کہ سرسید احمد خاں اور ابوالکلام آزاد اپنی گوناگوں مصروفیات کے سبب اپنی تفاسیر مکمل نہیں کر سکے۔

گزشتہ ۱۴ صدیوں میں علما و مشائخ نے وقت اور حالات کے تحت قرآن حکیم کی تفسیریں مختلف زبانوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن دورِ جدید میں کفر و الحاد اور لادینی افکار و نظریات اور سائنسی ایجادات و ترقیِ نو کے ماحول میں ایک ایسی تفسیر کی ضرورت تھی جو موجودہ دور میں پیدا شدہ تمام مشکلات کا اسلامی حل پیش کر سکے اور جدید ذہن کو لادینیت اور گمراہی کے قعرِ مذلت سے نکال سکے۔ مولانا مودودی کے پیشِ نظر یہی وہ عظیم مقصد تھا، جس کے لیے انھوں نے تفہیم القرآن کی تخلیق کی۔ تفہیم القرآن ان کی ساری زندگی کے مطالعے کا حاصل ہے۔ انھی کے لفظوں میں:

> میں نے پچھلے ۵۵ سال کے دوران فلسفہ، تاریخ، سائنس، اجتماعی علوم اور دینی علوم کا جتنا مطالعہ کیا ہے، اس سب سے اس تفسیر کے لکھنے میں کام لیا گیا ہے۔(۱)

تفہیم القرآن کے لکھنے میں مولانا نے مسلسل اور ان تھک محنت کے علاوہ حد درجہ احتیاط اور پورے احساسِ ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے قرآن کی ہر ہر آیت پر ٹھیر کر غور و فکر اور تحقیق و مطالعہ کیا ہے، اور قرآنی آیات و مقامات اور قصصِ قرآنی کی پوری تحقیق اور کامل اطمینان کے بعد ہی اسے تفہیم کے صفحات پر اتارا ہے۔ مولانا اپنے طریقۂ تفسیر کے سلسلے میں کہتے ہیں:

(۱) رسالہ الحسنات، یادگار مودودی نمبر، ص ۳۱۲۔

کسی خاص مقام پر پہنچ کر اگر میں کسی آیت یا قرآن کے بیان کو سمجھ نہیں سکا ہوں تو لکھنے کا سلسلہ روک کر اس وقت تک تحقیق اور مطالعہ کرتا رہا جب تک اطمینان نہیں ہو گیا کہ میں نے قرآن کا صحیح مدعا سمجھ لیا ہے۔(۱)

مولانا مودودی نے ایک خط میں اپنے مسلکِ تفسیر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

قرآن کی تفسیر کے معاملے میں میرا مسلک یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ میں جس حد تک وسعت ہے، میں اس کے حدود میں رہ کر ہی تفسیر کرتا ہوں۔ ان حدود سے باہر جا کر اپنے تخیل سے کوئی ایسی بات حتی الامکان بیان نہیں کرتا، جس کی گنجایش الفاظ قرآن میں نہ ہو۔(۲)

ماہر القادری صاحب کے نام ایک خط میں اس کی مزید وضاحت یوں کرتے ہیں:

میں تفسیر میں یہ نقطۂ نظر اختیار نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ سے الفاظ کے استعمال میں معاذ اللہ کوئی بے احتیاطی ہوئی ہے اور مفسر کا کام یہ ہے کہ اس کی اصلاح کرے۔ میرے نزدیک ہر تعبیر جو اللہ تعالیٰ نے اختیار فرمائی ہے، اس کے اندر ایک حکمت ہے اور میں نے اسی حکمت ہی کو سمجھنے اور بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔(۳)

لیکن ساتھ ہی انھوں نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ فکر و تدبر، تلاش و تحقیق اور حد درجہ احتیاط کے باوجود ایک انسان سے تسامحات کا ہونا ناممکن بات نہیں ہے۔

تفہیم القرآن کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

بہ ہر حال یہ حرفِ آخر نہیں ہے۔ ہر ناظر سے میری درخواست ہے کہ جہاں کوئی تشنگی محسوس ہو، یا کسی سوال کا جواب نہ ملے، یا مدّعا اچھی طرح واضح نہ ہو رہا ہو، اس سے مجھے مطلع کیا جائے تا کہ میں اس خدمت کو زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکوں۔ علمائے کرام سے بھی میں گزارش کرتا ہوں کہ مجھے میری غلطیوں سے آگاہ فرمائیں۔(۴)

ان سب کے باوجود تفہیم القرآن پر تفسیر بالرائے کا الزام لگایا گیا، لیکن الزام لگانے والے اپنے موقف کے سلسلے میں کوئی ٹھوس دلیل پیش کرنے سے قاصر ہی رہے۔

---

(۱) رسالہ الحسنات، یادگار مودودی نمبر، ص ۳۱۲۔

(۲) مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی، عاصم نعمانی، حصہ دوم، ص ۳۱۰۔

(۳) مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی، عاصم نعمانی، حصہ اوّل، ص ۲۴۱-۲۴۲۔

(۴) تفہیم القرآن، دیباچہ، ص ۶۔

مولانا مودودی نے اپنی تفسیر میں بین السطور ترجمے کے بہ جائے آزاد ترجمانی کے طریقے کو اپنایا ہے اور اس کی توجیہ انھوں نے دیباچہ تفہیم القرآن میں اس طرح کی ہے:

پہلی چیز جو ایک لفظی ترجمے کو پڑھتے وقت محسوس ہوتی ہے وہ روانیِ عبارت، زورِ بیان، بلاغتِ زبان اور تاثیرِ کلام کا فقدان ہے۔ قرآن کی سطروں کے نیچے آدمی کو ایک ایسی بے جان عبارت ملتی ہے جسے پڑھ کر نہ اس کی روح وجد میں آتی ہے، نہ اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، نہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں، نہ اس کے جذبات میں کوئی طوفان برپا ہوتا ہے، نہ اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز عقل وفکر کو تسخیر کرتی ہوئی قلب وجگر تک اترتی چلی جارہی ہے۔ میں نے اس میں قرآن کے الفاظ کو اردو کا جامہ پہنانے کے بہ جائے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کی ایک عبارت کو پڑھ کر جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے دل پر پڑتا ہے، اسے حتی الامکان صحت کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کردوں۔ اسلوبِ بیان میں ترجمہ پن نہ ہو، عربیِ مبین کی ترجمانی اردوے مبین میں ہو، تقریر کا ربط فطری طریقے سے تحریر کی زبان میں ظاہر ہو اور کلامِ الٰہی کا مطلب ومدعا صاف صاف واضح ہونے کے ساتھ اس کا شاہانہ وقار اور زورِ بیان بھی، جہاں تک بس چلے، ترجمانی میں منعکس ہوجائے۔ اس طرح کے آزاد ترجمے کے لیے یہ تو بہ ہر حال ناگزیر تھا کہ لفظی پابندیوں سے نکل کر اداے مطالب کی جسارت کی جائے۔[1]

واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے عربیِ مبین کی ترجمانی اردوے مبین میں کرنے کی کام یاب کوشش کی ہے، اور اس سلسلے میں انھوں نے اپنی ساری توجہ قرآنی لب ولہجے کی ترجمانی اور اردو مترادفات اور محاوروں کو ایک آہنگ کے طور پر پیش کرنے میں صرف کی ہے۔ ہر خیال اور مفہوم کے لیے علاحدہ الفاظ واصطلاحات کی توضیح اس ترجمانی کو حقیقت سے بالکل قریب کردیتی ہے، لہٰذا اردو تفسیر نگاری میں اسے ایک منفرد کارنامہ قرار دینا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔ مولانا مودودی سورتوں کی تفسیر سے قبل وجہِ تسمیہ، زمانۂ نزول، پس منظر، مرکزی موضوع اور مباحث کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور ان ہی کی روشنی میں زیرِ مطالعہ سورت کا مفہوم متعین کرتے ہیں۔ اس طرح کسی سورت کے مطالعے سے قبل ان سب چیزوں کے مطالعے سے پوری سورت کا لبِ لباب اور اس کا ایک عمومی خاکہ سامنے آجاتا ہے، جس سے اس سورت کا مطالعہ آسان ہوجاتا ہے۔

---

(۱) تفہیم القرآن، دیباچہ، ص ۶، ۱۰-۱۱۔

مولانا مودودی نے اپنی تفسیر میں مخاطب کی نفسیات، ذوق، علمی معیار اور جدید رجحانات کو پیش نظر رکھا ہے، اور اس سلسلے میں انھوں نے اپنی علمی برتری، عالمانہ مباحث و مجادلے اور فکری تسلط سے مکمل اجتناب کیا ہے۔ اس طرح جدید ذہن کے ہر طالب علم کے لیے اس میں استفادے کا بھرپور موقع فراہم کیا گیا ہے۔

مولانا مودودی کے طریقِ تفسیر میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے قرآن کے ہر موضوع اور مضمون کے لیے الگ الگ پیرا گراف بنانے کا طریقہ (Paragraphing) اختیار کیا ہے۔ اس طرح پورے قرآن کے مضامین کو علاحدہ علاحدہ پیرا گراف میں پہلی بار پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قرآن کے معروضی مطالعے کے لیے یہ طریقہ بہت کارآمد ہے۔

مولانا مودودیؒ نے تفسیر کے لیے بنیادی طور پر قرآن و سنت کو معیار و میزان بنایا ہے، اور علمائے سلف کی اہم اور متداول تفسیروں سے بھی استفادہ و استناد کیا ہے۔ لیکن مولانا کسی مفسر کی کسی رائے سے مرعوب ہونے کا مزاج نہیں رکھتے، بلکہ ان تمام وثائق و دلائل سے استفادہ کرتے ہوئے کسی ٹھوس نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کسی مفسر کے قول کو ترجیح بھی دیتے ہیں تو دلائل و براہین سے اس کا برحق ہونا ثابت بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تفسیر کو فرقہ وارانہ تعصب، علمی تفوق، فلسفیانہ موشگافی اور صرفی ونحوی مباحث سے مبہم اور گنجلک نہیں ہونے دیا ہے۔

ان کی تفسیر نگاری میں ایک اور بات یہ ہے کہ مولانا مسائلِ حاضرہ کو پیش کرنے میں سب سے پہلے عقلی توجیہ اور استدلال سے کام لیتے ہیں، اور پھر انھیں قرآنی دلائل وحقائق کے ذریعے اِفہام کے راستے سے سمجھانے اور سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح یہ فطری اور نفسیاتی اندازِ استدلال نہ صرف قرآن کے ہر طالب علم کو قائل کرتا ہے، بلکہ دینِ اسلام کو ایک فطری دین کے طور پر بھی پیش کرتا ہے۔

تفہیم القرآن کی امتیازی خصوصیات

مولانا مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن کی سب سے بڑی خوبی اس کا غیر معذرت خواہانہ انداز ہے۔ اردو میں تفسیر لکھنے والے روایتی تعلیم یافتہ مفسرین کی یہ کم مایگی رہی ہے کہ وہ جدید علوم و فنون اور سائنس وٹکنالوجی کی تحقیقات اور ایجادات سے مرعوب ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی تفسیروں میں دلائلِ توحید اور تصور آخرت کے باب میں بعض ناگفتہ بہ غلطیوں اور احساسِ کمتری

کے شواہد ملتے ہیں۔ اور بعض مفسرین مثلاً: سر سید، مفتی محمد عبدہٗ اور محمد اسد وغیرہ تو کہیں کہیں دینِ اسلام سے بے زار اور شرم سار نظر آتے ہیں، لیکن مولانا مودودی ایک مومنِ صالح اور مرد حق آگاہ کی طرح امام ابنِ قیم اور ابنِ تیمیہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے پورے دلائل وشواہد اور کامل اعتماد کے ساتھ حقیقتیں واشگاف کرتے ہیں۔ انھوں نے مغربی تہذیب وافکار کی یلغار، موجودہ نظامِ تعلیم وتربیت، اخلاق ومعاشرت اور سماج ومعاشرے میں رائج اوہام وخرافات کا مضبوط سائنٹی فک رد دلائل وبراہین کے ذریعے الم نشرح کیا ہے، اور ہر قسم کی مرعوبیت کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

تفہیم القرآن میں قدیم وجدید علوم کا حسین امتزاج ہے۔ اس میں جہاں علماے سلف کی تفسیروں کے حوالے ہیں، وہیں دوسری طرف یہ جدید ترین سائنسی تحقیقات، عمرانیات و لسانیات، فلسفہ وحکمت، سماجیات وسیاسیات اور تاریخ وجغرافیہ جیسے علوم کی انسائی کلوپیڈیا بھی ہے۔ اکتساب واستفادے کے معاملے میں مولانا مودودی کہیں بھی متعصب اور متکبر نظر نہیں آتے۔ انھوں نے نہایت فروتنی اور فراخ دلی سے علومِ قدیم وجدید سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

تفہیم القرآن کی ایک نمایاں خصوصیت، جو اسے تمام تفاسیر میں امتیازی حیثیت دیتی ہے، اس کے ترجمے یا ترجمانی کا انداز ہے، جس میں انھوں نے قرآن کے لب ولہجے، شوکت و صلابتِ الفاظ، عام فہم اور بامحاورہ زبان اور اسلوب کی سلاست وشیرینی کا خاص خیال رکھا ہے۔ اعلیٰ اور بے عیب زبان عربی مبین کی ترجمانی اردوے مبین میں کرنے کی کام یاب کوشش کی گئی ہے۔ انھوں نے عربی الفاظ ومترادفات اور محاوروں کے لیے معقول، مناسب شستہ ورواں اردو میں ترجمانی کی ہے۔

تفہیم القرآن ماہ نامہ ترجمان القرآن میں ۳۰ برس تک مسلسل شائع ہوتی رہی۔ اس دوران قارئین اور خیر اندیشوں کے لیے صداے عام تھی کہ وہ اس پر رائے دیں۔ اس طرح یہ تفسیر فکر ونظر اور تنقید وتنقیص سے گزر کر دوآتشہ بن گئی ہے۔ ان ۳۰ برسوں کی تفسیر میں ۲۰ ویں صدی کی ساتویں دہائی تک کی دینی وسیاسی، معاشی واقتصادی اور اجتماعی ومعاشرتی افکار و نظریات اور تصادم وکشاکش کی روداد پڑھی جاسکتی ہے۔

تفہیم القرآن کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ایک علمی وفکری تفسیر ہونے

کے ساتھ ساتھ تحریکی و دعوتی تفسیر بھی ہے۔ تفہیم القرآن کی یہ خصوصیت برعظیم میں اولیت کا مقام رکھتی ہے۔ اس تفسیر کے ہزاروں صفحات میں مولانا مودودی کی علمی و ادبی جدوجہد، زندگی بھر کے مطالعے کا نچوڑ اور تحریک اسلامی کے مشن کی متحرک تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔

تفہیم القرآن میں ایک خاص مقام اس کے مقدمے کا ہے، جس کو مولانا نے نیو سنٹرل جیل ملتان میں لکھا تھا۔ یہ مقدمہ تفہیم القرآن کے قارئین کے لیے شاہ کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے طریقۂ تفسیر و ترجمانی، تفسیر جدید کے تقاضے، تفہیم القرآن کی اہمیت و ضرورت اور قرآن کے اسالیب بیان کو وضاحت کے ساتھ ادبی پیرایے میں پیش کیا ہے۔

تفہیم القرآن میں جہاں مولانا مودودی کی دقّتِ نظر، عمقِ مطالعہ اور اجتہادی کوششوں کا پتا چلتا ہے وہیں ان کے دل نشیں اسلوب، حکیمانہ بصیرت اور منطقی طرزِ استدلال کا بھی بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح مولانا مودودی کی دیگر تصانیف میں ان کے مخصوص اسلوب اور خالص انشائی ادب کی شیرینی و حلاوت پائی جاتی ہے، تفہیم القرآن میں بھی یہ خصوصیات جا بجا دکھائی دیتی ہیں۔ ذیل میں چند اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں، جو مولانا مودودی کے مخصوص اسلوب کی نمایندگی کرتے ہیں اور جن میں ان کے طنز و ظرافت اور قوتِ استدلال کی پوری جھلک نظر آتی ہے:

۱- یعنی جن لوگوں کے سامنے روشنی پیش کی جائے اور وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیں، جنھیں راہِ راست کی طرف دعوت دی جائے اور وہ اپنے ٹیڑھے راستوں ہی پر چلتے رہنے کو ترجیح دیں، ان کے لیے اللہ کا قانون یہی ہے کہ پھر انھیں تاریکی ہی اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر چلنا اور ٹھوکریں کھا کھا کر گرنا ہی پسند کرتے ہیں۔ ان کو جھاڑیاں ہی باغ اور کانٹے ہی پھول نظر آتے ہیں۔ انھیں ہر بدکاری میں مزہ آتا ہے، ہر حماقت کو وہ تحقیق سمجھتے ہیں اور ہر فساد انگیز تجربے کے بعد اس سے بڑھ کر دوسرے فساد انگیز تجربے کے لیے وہ اس امید پر تیار ہو جاتے ہیں کہ پہلے، اتفاق سے، دہکتے ہوئے انگارے پر ہاتھ پڑ گیا تھا تو اب کے لعلِ بدخشاں ہاتھ آ جائے گا۔(۱)

۲- جو بیج زمین میں بویا جاتا ہے وہ بجائے خود مردہ ہوتا ہے، مگر زمین کی قبر میں جب

(۱) تفہیم القرآن، جلد اول، ص ۵۷۸۔

کسان اس کو دفن کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اندر وہ نباتی زندگی پیدا کر دیتا ہے، جس سے کونپلیں پھوٹتی ہیں اور لہلہاتی ہوئی کھیتیاں شانِ بہار دکھاتی ہیں۔ یہ بے شمار مردے ہماری آنکھوں کے سامنے آئے دن قبروں سے جی جی کر اٹھ رہے ہیں۔ یہ معجزہ کیا کچھ کم عجیب ہے کہ کوئی شخص اس دوسرے عجیب معجزے کو ناممکن قرار دے، جس کی خبر قرآن ہمیں دے رہا ہے۔ یعنی انسانوں کی زندگی بعد موت۔[۱]

۳- خدا ان مفسدوں کو خوب جانتا ہے، یعنی دنیا کا منہ تو یہ باتیں بنا کر بند کر سکتے ہیں کہ صاحب ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی اس لیے نیک نیتی کے ساتھ ہم نہیں مانتے۔ لیکن خدا جو قلب و جگر کے چھپے ہوئے رازوں سے واقف ہے، وہ ان میں سے ہر شخص کے متعلق جانتا ہے کہ کس کس طرح اس نے اپنے دل و دماغ پر قفل چڑھائے، اپنے آپ کو غفلتوں میں گم کیا، اپنے ضمیر کی آواز کو دبایا، اپنے قلب میں حق کی شہادت کو ابھرنے سے روکا، اپنے ذہن میں قبولِ حق کی صلاحیت کو مٹایا، سن کر نہ سنا، سمجھتے ہوئے نہ سمجھنے کی کوشش کی اور حق کے مقابلے میں اپنے تعصّبات کو، اپنے دنیوی مفاد کو، اپنی باطل سے الجھی ہوئی اغراض کو اور اپنے نفس کی خواہشوں اور رغبتوں کو ترجیح دی۔ اس بنا پر وہ ''معصوم گم راہ'' نہیں بلکہ درحقیقت مفسد ہیں۔[۲]

مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں جن مستند و متداول تفسیروں، حدیث، سیرت اور تاریخ کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے، ان پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اس تفسیر کے لکھنے میں کس قدر عمیق مطالعے اور تحقیق و جستجو سے کام لیا ہے۔ ذیل میں چند اہم کتابوں کی فہرست دی جا رہی ہے:

۱- احکام القرآن
۲- تفسیر ابن ہشام
۳- تفسیر تنویر المقیاس (ابن عباس)
۴- روح المعانی (علامہ آلوسی)
۵- تفسیر عکرمہ
۶- تفسیر الکشاف (زمخشری)
۷- بدایۃ المجتہد
۸- زاد المعاد
۹- تفسیر ابن جریر طبری
۱۰- تفسیر ابن کثیر

(۱) تفہیم القرآن، جلد پنجم، ص ۲۸۷، ۲۸۸۔
(۲) تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۱۱۴۔

۱۱-تفسیر کبیر (امام رازی)
۱۲-الجامع الاحکام القرآن
۱۳-غرائب القرآن
۱۴-نیل الاوطار
۱۵-تفسیر سدّی
۱۶-تفسیر قتادہ
۱۷-لسان العرب
۱۸-تفسیر بیضاوی
۱۹-بائبل
۲۰-تورات
۲۱-تلمود

مندرجہ بالا تفاسیر و تاریخی کتب کے بارے میں اہلِ علم جانتے ہیں کہ قرآن حکیم کی تفسیری تاریخ اور عربی زبان و ادب میں ان کتابوں کی کیا قدر و اہمیت ہے اور اس کا پایۂ استناد کس قدر بلند ہے۔

مکتوب نویسی

خط لکھنا ایک آسان اور سادہ عمل ہے۔ اگر چہ اردو نثر میں اس کی حیثیت ایک مسلمہ صنف کی نہیں لیکن مکتوب نگار کا اسلوب بہ ہر حال اس کی نگارش کو قابل توجہ بنا دیتا ہے۔ مکتوب نگاری کے لیے کسی فنی مہارت اور مشق و ریاض کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چوں کہ مکتوب نگاری کے لیے کوئی خاص اصول اور ضابطہ متعین نہیں ہے، اس لیے مکتوب نگار، بہ قدر پیمانۂ تخیلِ خویش، اس میدان میں اپنے اشہبِ قلم کا استعمال کرتے رہے ہیں۔ انسانی فطرت کا یہ 'شوقِ خامہ فرسائی' اپنے تکمیلی سفر میں مختلف جہانوں کی سیر کراتا ہے۔ مکتوب نگاری خدا داد صلاحیت ہے اور بلاواسطہ یا بالواسطہ محرکات اسے جاگر کرتے رہتے ہیں، اس لیے یہ ہمیشہ ترقی پذیر رہی ہے۔

گو کہ مکتوب نگاری بنیادی طور پر داخلی محسوسات کو سمتِ اظہار دیتی ہے اور یہ اظہارِ محسوسات صرف مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کی ذات تک محدود رہتا ہے، اس لیے اس کے کیف و کم سے صرف یہی دو شخصیتیں محظوظ ہوتی ہیں۔ لیکن جب مکتوب الیہ ان کیفیات سے متکیف و مسرور ہو کر انھیں عام کرنا چاہتا ہے یا ان کیفیات کو ''یارانِ نکتہ داں'' کے لیے صلاے عام بنانا چاہتا ہے، یا یہ چاہتا ہے کہ جس طرح وہ مکتوب نگار کے کمالِ اظہار و بیان سے لطف اندوز ہوا ہے، اسی طرح دوسرے اربابِ نظر بھی گوہرِ 'ذوقِ نظر' کی یافت پر نشاط آشنا ہوں تو وہ اسے منظرِ عام پر لاتا ہے، اور جب یہ خطوط منظرِ عام پر آتے ہیں تو یہ اربابِ ذوقِ نظر مکتوب نگار کی جادو بیانی اور اعجاز بیانی سے بہ قدرِ ظرف مسحور و مخمور ہوتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ مکتوب نگاری کے اصول و ضوابط کے معیار و خطوط متعین نہ ہونے کے باوجود، محض شوق خامہ فرسائی کی بنیاد پر چند اہلِ قلم کے خطوط اردو کے ادبِ عالیہ میں داخل

ہو چکے ہیں۔ ان میں مرزا غالب، مہدی افادی، مولانا آزاد، علامہ شبلی اور محمد علی ردولوی کے نام مکتوب نگاری کے عناصر خمسہ میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے اہل قلم ہیں جن کے ذاتی خطوط ایک 'شاہ کار' قرار دیے جاسکتے ہیں۔ درحقیقت مکتوب نگاری ہم کلامی ہی کی ایک شکل ہے، جسے خود کلامی بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس کا تعلق انسانی ذہن میں اٹھنے والے مختلف احساسات، جذبات اور کیفیات سے ہے، جو سطحِ ذہن سے نکل کر تحریر کی شکل میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ اس لیے خطوط کے مضامین برجستہ اور بے ساختہ ہونے چاہییں۔ جن خطوط میں تکلف و تصنع ہو اور مکتوب نگار کی شخصیت پردہ نشین ہو، قاری اس سے بہت جلد اکتا جاتا ہے۔ خطوط کا یہ اسلوب روحِ خط اور مکتوب نگار دونوں کے لیے یکساں مضر ہیں۔

زندگی، ایک بحرِ بے کراں ہے، جو ہر موجِ زندگی کو ایک نئی جہت سے روشناس کراتا ہے۔ تغیر و تبدّل کی اس دنیا میں ہر لمحے ایک نیا موضوع صفحۂ ہستی پر نمودار ہوتا ہے۔ اس لیے مکاتیب کے موضوع کی حد بندی نہیں کی جاسکتی۔ اس کے موضوعات روایتی ہجر و وصال، خوشی و غم، یاس و مسرت سے لے کر ملّی دردمندی اور معاشرتی زبوں حالی کی خونچکاں داستان تک کچھ بھی ہوسکتے ہیں۔

مکتوب اور آپ بیتی بڑی ہی دل چسپ اصناف ہیں۔ ان میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں۔ مکتوب بڑی حد تک گویا آپ بیتی ہی ہے، جس میں مکتوب نگار کو صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ مکتوب میں ایسے مواقع آ ہی جاتے ہیں جب قاری اس کے نہاں خانۂ دل میں جھانک سکتا ہے اور اس کے جذبات کے تموج کا راز داں بن سکتا ہے، کیوں کہ بہ قول شخصے 'خط میں مکتوب نگار کلیجا نکال کر رکھ دیتا ہے۔' یہ کیفیت آپ بیتی میں مشکل ہی سے آتی ہے۔

اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز غالب کے خطوط سے پہلے ہی ہوگیا تھا۔ لیکن ان میں فارسی اسلوب کا گہرا اثر تھا۔ یوں اردو مکاتیب کی ابتدا ہی فارسی کی تقلید سے ہوئی، اس لیے فارسی القاب و آداب سے پیچھا چھڑانا دِقّت طلب کام تھا۔ اس سلسلے میں غالب کے مکاتیب نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ مرزا غالب نے اپنے اردو مکاتیب میں فارسی مقفیٰ و مسجع عبارتوں کی جگہ سادہ و شگفتہ اسلوب اختیار کیا اور القاب و آداب کی فارسی روایت کے خلاف، خط میں بے ساختگی اور برجستگی کا چلن رائج کیا۔ اس لیے غالب کو جدید اردو مکتوب نگاری کا بانی کہنا چاہیے۔ غالب نے

مکتوب نگاری کو نئے اسلوب سے روشناس کیا، انھوں نے مراسلے کو مکالماتی انداز میں لکھا اور مکتوب نگاری کے باب میں عوام وخواص کے لیے ایک شاہ راہ متعین کردی۔ اس لیے ان کی تقلید میں بہت سے ماہرینِ ادب نے طبع آزمائی بھی کی۔ دورِ جدید تک، اردو مکتوب نویسی نے ایک طویل سفر طے کیا ہے اور نئی منزلوں سے آشنا ہوئی ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ ایک کام یاب علمی وادبی مکتوب کی پہچان یہ ہے کہ اس میں شایستگی و شرافت، ضبط وتمکین اور ایک خاص ادبی رچاؤ بہ درجۂ اتم موجود ہو اور وہ قاری کے ذوقِ نظر کی تسکین کر سکے نیز اس کا طرزِ تحریر نہ تو گنجلک ہو اور نہ مکتوب الیہ خط پڑھنے کے بعد ''دامِ ہر موج'' میں گرفتار ہو جائے۔ سادگی و بے تکلفی اور برجستگی و بے ساختگی خط کا معیارِ حسن ہے۔ چوں کہ خط کا تعلق ذاتی یا انفرادی احساسات وجذبات کے اظہار سے ہے، اس لیے خط میں مکتوب نگار کی شخصیت کی جیتی جاگتی جھلک کا نظر آنا بھی لازمی ہے۔

اردو میں علمی وادبی اور سنجیدہ وجذباتی خطوط لکھنے کی روایت رہی ہے۔ مولانا مودودی کا شمار ان کام یاب مکتوب نگاروں میں ہوتا ہے، جنھوں نے مکتوب نگاری کے اسلوب میں قابلِ قدر اضافے کیے ہیں۔ عالم گیر شخصیت ہونے کے باعث ان کے عزیزوں، شاگردوں، متعلقین اور معتقدین کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اس لیے مشاہیر، دانش ور، ملک اور بیرونِ ملک کے جامعات و کلیات کے اساتذہ وطلبہ، امرا اور حکمرانوں کے علاوہ صحافیوں، ادیبوں اور معروف اور غیر معروف شخصیتوں کے خطوط کا سلسلہ روزانہ جاری رہتا تھا۔ انھوں نے طبیعت ایسی پائی تھی کہ خط کا جواب دینا فرض سمجھتے تھے۔ بلاوجہ تاخیر انھیں ناگوار ہوتی تھی۔ پابندی سے خط لکھتے تھے اور اس کی تلقین بھی کرتے تھے۔ زندگی کے آخری ۳۲ برسوں میں انھوں نے ہزاروں خطوط لکھے۔ ان کے مکاتیب کے اب تک کم وبیش ۱۰ مجموعے ہندو پاک کے مختلف ناشروں نے شائع کیے ہیں۔ ان مجموعوں کے علاوہ ان کے مکاتیب کا ایک قابلِ لحاظ حصہ اب بھی غیر مطبوعہ ہے، جسے مرتب کرنے سے ایک ضخیم اور کارآمد مجموعۂ مکاتیب تیار ہو سکتا ہے۔ اس موقع پر یہ عرض کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پٹھان کوٹ سے ہجرت کے بعد مولانا مودودی کی پوری لائبریری حادثے کی نذر ہو گئی، ان کے مکتوبات کا ایک بیش قیمت حصہ بھی ضائع ہو گیا۔ یہ مکتوبات مشاہیر ودانش ورانِ عالم نے انھیں لکھے تھے۔ اس ناقابلِ تلافی نقصان کا افسوس انھیں تادمِ حیات رہا۔

مولانا مودودی کے شائع شدہ مکاتیب کی فہرست ذیل میں پیش کی جارہی ہے:

۱- Correspondence between Maulana Maudoodi and Maryam Jameelah — مرتبہ: مریم جمیلہ، لاہور، ۱۹۶۹

۲- مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی، حصہ اول — مرتبہ: عاصم نعمانی، لاہور، ۱۹۷۰

۳- مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی، حصہ دوم — مرتبہ: عاصم نعمانی، لاہور، ۱۹۷۰

۴- خطوط مودودی، حصہ اول — مرتبہ: رفیع الدین ہاشمی، سلیم منصور خالد، لاہور، ۱۹۸۳

۵- خطوط مودودی، حصہ دوم — مرتبہ: رفیع الدین ہاشمی، سلیم منصور خالد، لاہور، ۱۹۹۵

۶- مکتوبات مودودی — مرتبہ: اشرف بخاری، پشاور، ۱۹۸۳

۷- مکتوبات بنام مولانا محمد چراغ — مرتبہ: عبدالغنی، فیصل آباد، ۱۹۸۴

۸- مکتوبات سید ابوالاعلیٰ مودودی — مرتبہ: حکیم محمد شریف مسلم، لاہور، ۱۹۸۶

۹- مولانا مودودی کے خطوط — مرتبہ: سید امین الحسن رضوی، دہلی، ۱۹۹۳

۱۰- یادوں کے خطوط — مرتبہ: محمد یونس، حیدرآباد، ۱۹۸۳

مولانا مودودی کے مکتوبات کے مطالعے سے ان کے جذبات واحساسات، علمی وادبی میلانات، افکار ونظریات نیز ان کے سوانحی نقوش بڑی خوبی سے واضح ہوتے ہیں۔ یہ مکاتیب محض ''شوق خامہ فرسائی'' کا نتیجہ نہیں، بلکہ معاصرین کے مسائل ومشکلات اور استفسارات کا تشفی بخش اور سنجیدہ انداز میں حل اور جواب ہیں۔ یہ مکاتیب ان کی شخصیت اور افکار واحساسات کی آئینہ دار ہیں۔ ان خطوط کی روشنی میں اس عہد کی علمی و دینی، سیاسی وسماجی اور تہذیبی وثقافتی تاریخ مرتب کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مکاتیب کے مطالعے کے بغیر مولانا کی ہمہ پہلو سیرت وشخصیت، کردار وافکار کی سچی تصویر نہیں پیش کی جاسکتی۔

مولانا مودودی کا پہلا دستیاب خط ۱۰ رستمبر 1918 کا ہے اور آخری خط اپنی وفات سے

تین ماہ پہلے کا ہے، جو انھوں نے ۱۶ر جون ۱۹۷۹ کو اپنے بیٹے سید حسین فاروق مودودی کے نام لکھا تھا۔[1] اس طرح ان خطوط کا عرصۂ تحریر تقریباً ۶۰ برس کی طویل مدت پر پھیلا ہوا ہے۔ اس طویل عرصے میں انھوں نے جن اصحاب کو خطوط لکھے اور ان کے مسائل و مشکلات کا حل اور استفسارات کا کافی وشافی جواب اپنے مکتوبات میں پیش کیا، ان میں سے چند کے ناموں کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا عبد الباری، علامہ اقبال، سید نذیر نیازی، سید سلیمان ندوی، ابوالحسن علی ندوی، سید مناظر احسن گیلانی، مولانا شبیر احمد عثمانی، آیت اللہ روح اللہ خمینی، آغا شورش کاشمیری، ماہر القادری، نعیم صدیقی، پروفیسر خورشید احمد، مولانا محمد چراغ، محمد یوسف اصلاحی، چودھری غلام محمد، مریم جمیلہ، پروفیسر فروغ احمد، ڈاکٹر نذیر احمد شہید، مولانا مسعود عالم ندوی، سید ابوالخیر مودودی، سید امین الحسن رضوی وغیرہ۔

مکاتیب مولانا مودودی کے موضوعات و مسائل کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے اپنے مکاتیب میں تفسیر قرآن، شرحِ حدیث، مسائلِ فقہ، تفہیمِ شریعت و دین، تحریکی مسائل و مباحث، ہندو پاک کی دینی و سیاسی اور سماجی و معاشرتی صورت حال، مسئلۂ کشمیر، مسئلۂ قادیانیت، اشتراکیت، ادبی میلانات، رفقائے تحریک کے مسائل، زبان و قواعد وغیرہ موضوعات و مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان خطوں کی علمی و ادبی اور سیاسی و تاریخی حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا مودودی کے مکاتیب میں بہت سے خطوط اپنے اندر خاص طرح کی علمی شان لیے ہوئے ہیں۔ خصوصاً بعض لفظی تحقیقات، عربی و اردو زبان و بیان اور تذکیر و تانیث کے ضمن میں انھوں نے بصیرت افروز نکات پیش کیے ہیں۔ ادبی نقطۂ نگاہ سے یہ اردو زبان کا گراں مایہ سرمایہ ہیں۔ مثال کے طور پر ماہر القادری کو لکھے گئے خطوط سے چند اقتباسات ملاحظہ کریں، جن سے اردو صرف ونحو اور تذکیر و تانیث پر ان کی دسترس کا اندازہ ہوتا ہے:

> ۱- انگریزی الفاظ کی تذکیر و تانیث کا فیصلہ اہلِ زبان دو بنیادوں پر کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا ہم معنی اردو لفظ مذکر ہے یا مؤنث۔ دوسرے یہ کہ اس کی صوت (Sound) ذوقِ اردو کے لحاظ سے تانیث کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے یا تذکیر کے ساتھ- کلچر تہذیب و ثقافت کے ہم معنی ہے اور اس کی صوت بھی تذکیر سے

---

(۱) خطوط مودودی، دوم، ص ۱۸۔

مناسبت نہیں رکھتی۔ اس لیے کلچر اسی طرح مؤنث ہے، جس طرح اگیری کلچر، کیوں کہ وہ زراعت کے ہم معنی ہے اور اس کی صوت بھی ذوقِ اردو کو مؤنثانہ محسوس ہوتی ہے۔(۱)

۲- تعجب یہ ہوا کہ آپ ''نہ ہی'' اور ''نہ یہی'' کے درمیان کوئی فرق نہیں سمجھتے اور دونوں کو یکساں غلط قرار دیتے ہیں، حالاں کہ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ انگریزی لفظ NOR کا ترجمہ آج کل بہت سے لوگ ''نہ ہی'' کرتے ہیں اور یہ قطعی غیر اردو طرز بیان ہے۔(۲)

۳- شوریٰ سے شورائی اور شوروی، دونوں اردو میں صحیح ہیں اور اہل علم دونوں طرح لکھتے ہیں۔ تہمت کو تہمد لکھنا ایک تکلف ہے، اسے تہبند سے ماخوذ سمجھنا اور اور بھی مہمل ہے کیوں کہ تہبند بہ جائے خود کوئی صحیح الاصل لفظ نہیں۔ اس لفظ کا املا تہمت بہ 'تا' ہے۔(۳)

مکاتیبِ مودودی کا معتد بہ حصہ ایسا بھی ہے، جس میں انھوں نے بعض تفسیری نکتے بیان کیے ہیں یا پھر مشکل آیات کی تفسیر اور مختلف تفاسیر پر اظہار خیال کیا ہے۔ یہ مکاتیب ان کے فہمِ قرآن، تبحرِ علمی اور دین سے گہری وابستگی کے مظہر ہیں، اور ان کے احیائی میلانات اور رواداری کے آئینہ دار بھی۔ چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

۱- عربی زبان کی مختصر تفسیروں میں میرے نزدیک کشّاف سب سے بہتر ہے۔ اعتزال کے نظریات کی جھلک جہاں جہاں ہے اسے نظر انداز کرتے ہوئے قرآن سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔ سیرتِ پاک پر اب تک کوئی کتاب ایسی نظر سے نہیں گزری، جس کی سفارش کرسکوں۔

۲- میرے نزدیک مولانا فراہی نے سورۂ فیل کی جو تفسیر فرمائی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ خود سورۂ فیل کا نظم ہی اس تفسیر کو قبول نہیں کرتا۔ اگر بات وہ ہوتی جو مولانا فراہی نے سمجھی ہے تو سورت کی ترتیب یوں ہوتی کہ ترمیهم بحجارة من سجيل فارسل عليهم طيراً ابابيل فجعلهم كعصف مأكول۔(۴)

۳- آپ مولانا عبدالماجد دریابادی، عبداللہ یوسف علی اور پکتھال کے ترجموں کو ایک ساتھ پڑھیں تو ان شاء اللہ قرآن کے مطالب سمجھنے میں سہولت ہوگی۔ محمد علی لاہوری

---

(۱) مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی، عاصم نعمانی، حصہ اوّل، ص ۲۰۲-۲۰۳۔

(۲) ایضاً، ص ۲۰۲۔

(۳) ایضاً، ص ۱۹۱-۱۹۲۔

(۴) مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی، عاصم نعمانی، حصہ اوّل، ص ۱۴۷۔

احمدیوں کے گروہ سے تھے، ان کا ترجمہ وتفسیر گم راہیوں سے پاک نہیں ہے، اس لیے
قرآن کے طالب علم کے لیے وہ قابل اعتماد نہیں ہے۔(۱)

۴-النازعات غرقاً سے مراد وہ فرشتے ہیں جو رگ رگ میں اتر کر جان کھینچ نکالتے
ہیں اور الناشطات نشطاً کا اشارہ اس طرف ہے کہ وہ جان کو نکال کر ایک عالم سے
دوسرے عالم میں لے جاتے ہیں۔ السابحات سبحاً سے مراد احکام الٰہی کی تعمیل
میں دوڑنے کے ہیں...... نفاثات جمع ہے نفاثہ کی اور یہ علاّمہ وفہامہ کی طرح مبالغہ
کے معنی میں ہے۔ اس کا اطلاق مرد اور عورت دونوں پر ہوسکتا ہے۔ عقد جمع ہے
عقدہ کی اور اس سے مراد وہ گرہیں ہیں جو جادوگر باندھتے ہیں۔(۲)

مولانا مودودی کے مکتوبات کی ایک اور خصوصیت ان کا حقیقت پسندانہ اور مجتہدانہ انداز فکر ہے۔ یوں تو ان کی حقیقت پسندی اور اجتہادِ فکری کا اندازہ ان کے دیگر علمی کارناموں سے بھی ہوتا ہے لیکن ان خطوط کی خوبی یہ ہے کہ ان کا اندازِ فکر نمایاں طور پر نکھر کر سامنے آجاتا ہے اور گویا ایک سطح پر ان کے علمی کارناموں کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ انھی خطوط میں انھوں نے کہیں کہیں مستشرقینِ یورپ کے علمی وفکری فساد کے ضمن میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مولانا مودودی کے خطوط کے ذریعے ان کے مزاج ومیلان اور جملہ اصلاحی کاوشوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ انھیں جہاں ایک طرف ہندستان کی نام نہاد سیکولر حکومت کی تنگ نظری اور مسلم دشمنی کا قلق تھا، وہیں دوسری طرف انھیں پاکستان کے سیاسی وتہذیبی انحطاط پر بھی سخت افسوس تھا۔ انھوں نے نہ صرف اظہارِ ملال پر اکتفا کیا بلکہ ترجمان القرآن اور اس کے علاوہ متعدد خطوط کے ذریعے اس صورتِ حال کے خلاف شدید احتجاج بھی کیا اور عوام الناس کو اس کی طرف متوجہ بھی کیا۔ اسلامی سیاست، مسلم کلچر اور تعمیرِ ملت کے باب میں مولانا مودودی کی خدمات کی ہم سری کوئی نہیں کرسکتا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بالکل درست لکھا ہے:

مولانا ابوالاعلیٰ کی خدمات جلیلہ سے امت مسلمہ کبھی صرف نظر نہیں کرسکتی کہ ایسے
کارہائے نمایاں تاریخ جدید اسلام کے ہر باب وفعل کے لیے سرمایۂ افتخار وبہ درجۂ عنوان
ہیں۔ مولانا گلشنِ حق کے ان لالہ وسنبل میں سے ہیں جن کی خوش بوے سدا بہار

(۱) مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی، عاصم نعمانی، حصہ اوّل، ص ۱۱۴۔

(۲) ایضاً، ص ۱۲۷۔

ہمیشہ تعفّنِ باطل کو مغلوب کر کے طالبانِ حق کے دل و دماغ کو معطر کرتی رہتی ہے اور جسے فنا نہیں۔ ”ثبت است برجریدۂ عالم دوامِ ما“(۱)

جہاں تک مکاتیبِ مودودی کے اسلوبِ بیان کا تعلق ہے، سادگی و بے تکلفی اور بے ساختگی و شگفتگیِ تحریر کم و بیش تمام خطوط میں موجود ہے اور اپنے بے تکلف احباب کے نام خطوط میں یہ بے تکلفی دوبالا ہوجاتی ہے۔ اسلوب کی تازہ کاری اور بے تکلفی کی برہان یہ دو خطوط جو انھوں نے سید امین الحسن رضوی، سابق ایڈیٹر Radiance کے نام لکھے، ملاحظہ کریں:

۱- آپ کی فرمایش کی تکمیل تو آپ کی یہاں تشریف آوری پر ہی ہوسکتی ہے، مگر میری فرمایش آپ کسی ذریعے سے بھی پوری کر سکتے ہیں۔ محلّہ بلی ماران دہلی میں فیض الحسن صاحب کے یہاں گاجر کی تری نہایت نفیس بنتی تھی۔ اگر اب بھی بنتی ہو تو بھجوادیں۔ مگر وہ جاڑے ہی میں بنتی ہے اور جاڑے ہی میں یہاں تک بہ خیریت آسکتی ہے(۲)

۲- یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ آپ کراچی سے واپسی پر لاہور آئے اور بارش کی وجہ سے مجھ سے نہ مل سکے۔ خیر، یار زندہ صحبت باقی۔ ماش کی دال(۳) کا پروگرام آیندہ ملاقات کے لیے برقرار(۴)

مولانا مودودی کے خطوط میں غرورِ علم، کبر و مرتبت اور انانیت کی گنجایش نہیں ہے۔ درجِ ذیل خط میں انھوں نے کس درجہ عجز و انکسار اور خاکساری سے اعترافِ قصور کیا ہے۔ یہ بے نفسی کم ہی لوگوں کے ہاں ملتی ہے:

آپ کے مخلصانہ مشوروں اور تنبیہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں ایک انسان ہوں اور انسان ہر وقت معیاری کام کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ اس کو دوستوں اور خیر خواہوں کی مدد درکار ہوتی ہے کہ جب وہ معیار سے گرے تو وہ اسے تنبیہ کردیا کریں۔ آیندہ بھی مجھ کو مخلصانہ مشوروں سے محروم نہ رکھیں(۵)

---

(۱) ماہ نامہ تجلی ’دیوبند‘ سال نامہ، ۱۹۷۱ ص ۲۴۹۔
(۲) مولانا مودودی کے خطوط، سید امین الحسن رضوی، ص ۹۹۔
(۳) ماش کی دال مولانا کو بہت مرغوب تھی۔ رضوی صاحب نے ایک خط میں اس بات کا ذکر کیا تھا کہ ”میری ماش کی دال ان پر قرض ہے۔“
(۴) مولانا مودودی کے خطوط، ص ۹۵۔
(۵) مولانا مودودی کے خطوط، ص ۵۳۔

الفاظ سادہ و پرکار، مگر مفہوم واضح۔ نہ الفاظ کی جھڑی اور نہ پھلجڑی۔ خاکسار مجسم انکسار تحریر سے مزاج کا اظہار۔ یہی ان کی انفرادیت ہے۔

مولانا مودودی کے بعض خطوط میں طنز و مزاح کی ہلکی چاشنی بھی ملتی ہے۔ تاہم اس سے ان کی سنجیدگی اور عظمت مجروح نہیں ہوتی، بلکہ ان کی زندہ دلی کا احساس ہوتا ہے۔ مولانا فکری بلندی کے ساتھ طبعاً خوش مذاق واقع ہوئے ہیں۔ طنز کیا تو تیشہ زنی سے پرہیز کیا اور مزاح پر اترے تو لفظوں نے تبسم بکھیر دیا۔ صرف دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱- آج کل عرفِ عام میں جس چیز کو مناظرہ کہا جاتا ہے، اس کی نوعیت مرغ بازی کی سی ہے...... پیشہ ور اور جھگڑالو مناظرے بازوں سے چونچیں لڑانا میرا کام نہیں ہے۔(۱)

۲- اب لڑکیوں میں یہ چرچے ہو رہے ہیں کہ کون سی صاحب زادی کس استانی کی منظورِ نظر ہے اور کون سی صاحب زادی کسی دوسری صاحب زادی کے عشق میں مبتلا ہے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ انھیں حسرت یہ ہے کہ کاش، ملاّ کی مخالفت و مزاحمت راہ میں حائل نہ ہوتی تو وہ ترقی کے مزید قدم ذرا نہ جلدی جلدی اٹھا سکتے۔(۲)

مولانا مودودی کے مکاتیب کی ایک اور نمایاں خصوصیت ان کی مکتوب نگاری کی مستقل روایت ہے، جسے وہ اپنی تمام مکتوبات میں لازمی طور پر ملحوظ رکھتے ہیں۔ خط لکھنے سے پہلے دائیں طرف شکن ڈال کر حاشیہ چھوڑنا، پیرے بنانا، علامات ڈالنا، سطر کا نظم و ترتیب اور تحریر کی صفائی با قاعدہ طور پر ان کے مکتوبات میں موجود رہتی ہے۔ ان کے مکتوب نگاری کا ایک اور قاعدہ یہ تھا کہ خط کی پیشانی پر ہمیشہ تاریخ ضرور درج کرتے(۳) ابتدا محترمی و مکرمی (اور خواتین کے لیے محترمہ و مکرمہ) السلام علیکم و رحمۃ اللہ سے کرتے۔ جوابی خط کا آغاز 'آپ کا عنایت نامہ ملا' سے کرتے اور خاتمہ 'خاکسار ابوالاعلیٰ' پر کرتے، جو خط کے بائیں کونے پر لکھا ہوتا تھا۔ خط کا پتا ''بہ خدمت شریف جناب'' کے مقررہ الفاظ سے شروع ہوتا تھا۔ یہ پتا زیادہ تر تین سطروں پر مکمل ہوتا۔ شہر یا مقام زیرِ خط کشیدہ ہوتا تھا۔ مولانا مودودی کا یہی مستقل طریقِ مکتوب نگاری تھا۔ ان

(۱) رسائل و مسائل، حصہ چہارم، ص ۳۵۔

(۲) ترجمان القرآن، جون، جولائی ۱۹۵۲، ص ۲۴۶۔

(۳) مولانا اپنے ابتدائی دور کے خطوں میں قمری تاریخ لکھتے تھے۔ بعد میں قمری اور شمسی دونوں تاریخیں درج کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ آخری دور کے خطوط میں صرف شمسی تاریخ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

کے مکاتیب میں قطع و برید اور غیر ضروری الفاظ اور فقروں کی ثقالت کے برعکس، نفسِ مضمون کی وضاحت نہایت سادگی اور اختصار سے ہوتی تھی۔ مولانا مودودی کے اس طرز مکتوب نگاری کو دیکھ کر جو رائے قائم کی جاسکتی ہے، وہ یہی کہ لکھنے والا ایک متوازن اور مستقل مزاج شخص ہے، جو پوری ذمہ داری کے ساتھ لکھ رہا ہے۔ اس کی زندگی میں نظم وضبط، باقاعدگی اور ایک خاص سلیقہ وہنر ہے۔

بیسویں صدی کی فکری اور نظریاتی جنگ میں مولانا مودودی نے خود کو فرقہ وارانہ موقف سے دور رکھا۔ مناظرہ ومجادلہ اور منفی نزاع سے اجتناب کرتے ہوئے انھوں نے مثبت، تعمیری اور اصولی حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ عزیمت واستقلال اور تحمل وبردباری ان کے خطوط کے ہزاروں صفحات میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ مولانا مودودی کے تمام خطوط میں نہ بے جا القاب وآداب ہیں اور نہ ایسی بے تکلفی کہ مکتوب الیہ کے ساتھ دوزانو بیٹھ کر محوِ گفتگو ہوں۔ ان کی دیگر علمی وادبی نگارشات پر علمیّت اور طرزِ انشا کا غلبہ ہے، مگر ان کے مکاتیب نہایت سادہ اور دلکش ہیں۔ ان کی مکتوب نگاری کا طرز شایستہ وشگفتہ اور بے تکلفانہ ہے۔ مولانا کے مکتوبات سے ان کی سیرت وکردار، سیاسی بصیرت، مزاج ومیلانات، عصری شعور وآگہی، دینی وعلمی شخصیت اور زندگی کے ظاہر ومخفی گوشے سامنے آجاتے ہیں۔ مولانا کے مکتوبات کے بارے میں بھی وہی تاثر پیش کیا جاسکتا ہے جو علامہ اقبال کے خطوط کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے:

> ان کے خط ہر قسم کے تکلف سے پاک ہیں۔ وہ صرف مطلب کی بات کہتے ہیں اور مطالب کو علمی عبارت میں ادا کرتے ہیں۔ زیبایش وآرایش یا ادبی تان پیدا کرنے کا کوئی اہتمام ان کے یہاں نہیں۔ ان کے خط تنہائی اور افسردگی کے لمحات کی پیداوار نہیں، بلکہ ضرورتِ وقت کے تابع ہوتے ہیں۔ عموماً مختصر خط لکھتے ہیں۔ جہاں ان کا مدعا ختم ہوا، وہیں ان کا قلم رک گیا۔ ان کے خطوں سے ان کی شخصی عادات واذواق سے زیادہ ان کے افکار وتصورات کی تشریح ہوتی ہے اور واقعاتی سوانح سے زیادہ ان کے فکر پر روشنی پڑتی ہے۔[1]

---

(۱) پیش لفظ از خرم مراد: خطوط مودودی، دوم، مرتبین: رفیع الدین ہاشمی، سلیم منصور خالد، ص ۱۵-۱۶۔

باب سوم

اسلوبِ نثر

گزشتہ ابواب میں مولانا مودودی کی حیات و شخصیت اور ان کی جملہ علمی و ادبی کارناموں کا مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن یہ مطالعہ اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک کہ ان کے علمی و ادبی اسالیب کا جائزہ نہ لے لیا جائے۔ اسالیب کا یہ جائزہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ کسی بھی فن پارے کی تاثیر میں جتنا اہم کردار معنی و مفہوم کا ہوتا ہے، اتنا ہی فن کار کے طرزِ ادا کا بھی ہوتا ہے۔ آیندہ صفحات میں ہم مولانا مودودی کی ادبی تخلیقات میں کارفرما اسالیب کا معروضی جائزہ لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں پہلے اسلوب اور اس کے تشکیلی عناصر اور اردو کے نثری اسالیب پر اظہارِ خیال کے بعد، مولانا مودودی کے اسلوبیاتی محاسن تلاش کیے جائیں گے۔

اسلوب کیا ہے؟

سقراط نے کہا تھا: 'انسان اپنے کلام سے پہچانا جاتا ہے۔' کلام کیا ہے؟ انسانی خیالات اور جذبات و احساسات کا ترجمان، اور جو کلام ادائے خیالات اور اظہار جذبات کے لیے وسیلے کا کام کرتا ہے، دراصل اسی سے اسلوب کی تشکیل بھی ہوتی ہے۔ یوں ہر شخص کے سوچنے اور محسوس کرنے کا مخصوص انداز ہوتا ہے۔ سوچنے اور محسوس کرنے کا یہ مخصوص انداز آدمی کے لب و لہجے میں ایک انفرادیت پیدا کر دیتا ہے، اور یہی انفرادیت فن کار کا اسلوب کہلاتا ہے۔ فنونِ لطیفہ میں، خواہ مصوری ہو یا بت تراشی، موسیقی ہو یا ادب، اسلوبِ ادا کی بڑی اہمیت ہے۔ جب ہم کسی شعر یا نثر پارے کی تعریف کرتے ہیں تو بسا اوقات اس کے موضوع کی نہیں بلکہ اس اسلوبِ ادا

کی تعریف کرتے ہیں، جو فن کار نے اپنی تخلیق میں اختیار کیا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں اسلوب کی درج ذیل تعریفیں جامع اور مستند کہی جا سکتی ہیں:

☆ مصنف کی شخصیت ہی کا دوسرا نام اسلوب ہے۔ (بوفون)

☆ اسلوب، خیال کا لباس ہے۔ (پوپ)

☆ اسلوب، مصنف کی تمام زندگی کا عکس ہے۔ (ڈاکٹر زور)

☆ اسلوب اس طرز تحریر اور طرز بیان کا نام ہے، جس کے ذریعے ایک شخص اپنے خیالات اور جذبات کو بیان کرتا ہے۔ (ایلن وارنر)

☆ اسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کی وہ انفرادی طرزِ نگارش ہے، جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے ممیّز ہوتا ہے۔ (عابد علی عابد)

☆ اسلوب کی عظمت شخصیت کی صدائے بازگشت ہے۔ (لیوکس)

ان تمام تعریفات کا مجموعی تاثر یہی مرتب ہوتا ہے کہ اس میں بیک وقت جامعیت بھی ہے، وسعت و تنوع بھی اور بوقلمونی و نیرنگی بھی۔ اسلوب کی اہمیت علمائے ادب کے درمیان نزاعی مسئلہ نہیں رہی، بلکہ اس میں جدت طرازی ان کا وتیرہ رہی ہے۔ یہ جدت طرازی اگر شعوری ہوئی تو خونِ جگر کرنا پڑا یا پھر ماحول کے ذریعے ان کے لاشعور کی پرداخت نے انھیں ایک خاص میزان عطا کر دیا۔ چناں چہ اس فطری طرزِ ادا نے ایک مخصوص اسلوب کی شکل اختیار کر لی اور اسی کے ذریعے، وہ اپنے فکر و خیال کے مؤثر اظہار و ابلاغ پر قادر ہوا۔ فن کار کے ہر تخلیقی عمل میں اسلوب کی حیثیت ایک معتبر معاون کی ہے۔ فن کار اسلوب کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا اور اسلوب کی بقا، بہ ہر حال ایک فن کار کی بنیادی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی بھی ادب پارے کو مؤثر اور دل پذیر ہونے کے لیے اس کے اسلوب کی انفرادیت لازمی ہے، جس کی تزئین کاری کے لیے اس میں دل کشی اور دل نشینی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اسلوب کی یہی خصوصیت ایک عام لکھنے والے اور صاحبِ طرز ادیب میں امتیاز قائم کرتی ہے۔

مولانا مودودی کا اسلوب

اسلوبِ بیان کے تشکیلی عناصر میں بہ قدرِ پیمانہ تخیل ایک فہرست مرتب کی جا سکتی ہے۔

لیکن اگر اس میں اختصار برتا جائے تو جو عناصر ناگزیر کہے جا سکتے ہیں ان کی تعداد متعین کرنے کی غرض سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی تشکیل میں پانچ عناصر کارفرما ہوتے ہیں: ۱-مصنف، ۲-ماحول، ۳-موضوع، ۴-مقصد اور ۵-مخاطب۔

اسلوب کی تشکیل میں مصنف کی شخصیت کا بڑا دخل ہوتا ہے، کیوں کہ اسلوب مصنف کی شخصیت ہی کا عکس ہوتا ہے۔ مصنف کی تحریروں میں ان کے جذبات و احساسات اور افکار و نظریات ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مولانا مودودی کی تحریریں ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہیں۔ مولانا بنیادی طور سے ایک سنجیدہ علمی و تحریکی اور انقلاب آفریں رہ نما تھے، اس لیے ان کی تمام تحریروں میں ایک ہمہ جہت شخصیت کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ ایک قائد ہونے کی حیثیت سے انھیں عوام سے بے پایاں ہمدردی اور بے لوث محبت تھی اور اس لیے انھوں نے ملک و ملت کے سر پر منڈلاتے ہوئے طوفانی حوادث اور فکری و نظریاتی یلغاروں سے نبرد آزمائی کی ہے، اس لیے ان کی تحریروں میں خلوص، دردمندی اور شفقت و رحمت پائی جاتی ہے۔ دوسری قابل توجہ بات یہ کہ ان کی فکر کا خمیر قرآن و حدیث کی آفاقی و انسانی تعلیمات سے تیار ہوا ہے، اور انھوں نے اپنی تمام علمی و ادبی کاوشوں میں اس مخزنِ علم کا ساتھ کہیں نہیں چھوڑا ہے، اس لیے ان کی تحریریں حکمت و دانش اور تدبر و فکر کی داعی بھی ہیں۔ قرآن و حدیث سے اسی والہانہ وابستگی اور فکرِ قرآن کی علم برداری نے ان کے اسلوب میں اختصاصی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ یہاں ان کا اسلوب دوسرے لکھنے والوں سے منفرد ہو گیا ہے۔

اسلوب کی تشکیل میں مصنف کے ماحول کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ مصنف کے ذہن و کردار کی تعمیر اور افکار و نظریات کی تشکیل ایک مخصوص ماحول میں ہوتی ہے۔ مصنف اپنے وقت کی سماجی اقدار اور ادبی مذاق سے آگاہ ہوتا ہے، اس لیے اس کی ہر تخلیق زمانے کے مقتضیات سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ چوں کہ ادبی تخلیقات اپنے عہد اور ماحول کے سیاسی و سماجی شعور و آگہی کی نمایندگی کرتی ہیں، اس لیے مصنف کا اپنے ماحول سے متاثر ہونا ایک فطری عمل ہے۔ مولانا مودودی کے اسلوب کی تشکیل میں ان کے پاکیزہ علمی و مذہبی گھرانے کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔ انھوں نے بچپن ہی میں حالی کی شاعری اور آزاد کی انشا پردازی سے اکتسابِ فیض کیا تھا۔ ان کے والدِ محترم اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سنجیدہ علمی و مذہبی شعور رکھتے تھے۔ ان کی تربیت ہی کا اثر تھا کہ مولانا کی زبان میں

پختگی، شرافت، لطافت اور نفاست وشایستگی کی خصوصیات پیدا ہوئیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس دور کے مشہور اہلِ زبان اساتذہ کرام مثلاً: جوش ملیح آبادی، نیاز فتح پوری، مولانا محمد علی جوہر وغیرہ کی صحبت اٹھائی اور زندگی کا بیش قیمت زمانہ دہلی کے شرفا کے ماحول میں گزارا تھا، اس لیے ان کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے، جس میں سادگی و شگفتگی اور سلاست وروانی جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یہاں ان کی نثر دبستانِ دہلی کی نمایندہ نثر کہی جاسکتی ہے۔

اسلوب کی تشکیل میں موضوع ایک لازمی عنصر ہے۔ یعنی یہ کہ مصنف کس موضوع پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہے؟ اس کی نوعیت کیا ہے؟ اس کا موضوع ادب ہے یا سائنس، فلسفہ ہے یا تاریخ؟ مذہب ہے یا سیاست؟ صحافت ہے یا افسانہ؟ ڈراما ہے یا انشائیہ؟ الغرض اصناف اور موضوعات کے بدلنے سے اسالیب میں بھی تبدیلی ہونا امرِ لازم ہے۔ سائنسی موضوعات پر محاوروں اور تمثیلوں کی زبان اور سوانح نگاری میں صحافتی زبان واسلوب اختیار کرنا مضحکہ خیز اور ابلاغِ خیال کے لیے ناکافی ہوگا۔

مولانا مودودی کی تحریروں کے موضوعات مختلف النوع ہیں۔ انھوں نے فلسفہ وسیاست، تاریخ وتمدن، معیشت ومعاشرت، فکروشخصیت، حدیث وسیرت، تفسیرِ قرآن اور مسائلِ حاضرہ پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اس کے علاوہ، وہ زندگی بھر کئی رسالوں اور اخباروں سے منسلک بھی رہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی تحریروں کے احاطے میں مختلف موضوعات تھے۔ جب موضوعات میں اتنی کثرت ہوگی تو اسلوب میں بھی تنوّع فطری طور پر ہوگا۔ مولانا کی تحریروں میں اسلوب کا یہ تنوّع واضح اور نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب 'خطبات' اور 'دینیات' کا اسلوب 'تنقیحات'، 'تفہیمات' سے خاصا مختلف ہے۔ اسی طرح ان کی تفسیر 'تفہیم القرآن' کا اندازِ بیان 'اسلامی تہذیب کے اصول ومبادی' اور 'الجہاد فی الاسلام' سے جداگانہ ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے موضوعات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ موضوعات اور اسلوب میں تنوّع اور رنگارنگی کے باوجود، سادگی وصفائی اور شستہ اندازِ بیان ایک مشترک صفت کے طور پر ان کی تمام تحریروں میں نمایاں ہے۔

موضوع کے بعد اسلوب کی تشکیل میں وہ مقصد بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، جو مصنف کو اظہارِ خیال کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ یہ مقاصد مختلف طرح کے ہوسکتے ہیں۔ بعض تخلیقات کا مقصد

معلومات میں اضافہ کرنا ہوتا ہے اور بعض کا مقصد قاری کے ذہن میں دیرپا اثرات مرتسم کرنا۔ بعض مصنفین کے پیشِ نظر قاری کے لیے لطف ولذت اور دل بستگی کا سامان کرنا ہوتا ہے، اور بعض کا مطمحِ نظر انسانی ذہن کی تعمیر و تشکیل ہوتا ہے۔ مولانا آزاد کے پیشِ نظر قارئین کو متاثر کرنا تھا، اس لیے ان کے یہاں تأثراتی اسلوب جلوہ فرما ہے۔ سرسید کا مقصد اصلاحِ ملت تھا، اس لیے انھوں نے مدلّل اندازِ بیان اختیار کیا، جب کہ رشید احمد صدیقی، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور پطرس بخاری وغیرہ نے قارئین کو محظوظ کرنے کی کوشش کی، اس لیے ان کے یہاں مزاحیہ اسلوب کارفرما ہے۔ اسلوب کے لیے مقصدیت بے حد اہم عنصر ہے۔ مقصد کے بدل جانے سے اسلوب بھی بدل جاتا ہے۔ اس کی واضح مثال غالب کے خطوط اور ان کے تقریظوں کے اسلوب ہیں، جو ایک دوسرے سے یک سر مختلف ہیں۔

مولانا مودودی کی تصانیف کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ان کے موضوعات مختلف تھے، اسی طرح ان کے مقاصد بھی مختلف تھے۔ ان تصانیف میں کہیں ان کا مقصد تہذیب وثقافت پر تنقید ہے اور کہیں مسلمانوں کی اصلاح و بیداری، کہیں دینی و علمی مسائل کی توضیح وتشریح ہے اور کہیں قرآن وحدیث کی تفہیم وتفسیر۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی معرکہ آرا تصنیف 'تفہیم القرآن' کا اسلوب 'پردہ' سے مختلف ہے اور 'خطبات' کا انداز بیان 'تفہیمات' سے جدا ہے۔ موضوع کی تبدیلی نے ان کے اسلوبِ نگارش کو بھی متاثر کیا ہے۔ تفہیم القرآن، خطبات اور دینیات وغیرہ میں آسان، عام فہم اور سادہ ودل نشیں لب ولہجہ اختیار کیا گیا ہے، جب کہ تنقیحات، تفہیمات، پردہ اور اسلامی تہذیب کے اصول ومبادی وغیرہ کتابوں میں سنجیدہ وعلمی اور متین ودبیز نثر کی خوبیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

اسلوب کی تشکیل میں آخری عنصر مخاطب ہے۔ مخاطب کے ذہنی معیار اور علمی استعداد کے پیشِ نظر ہی مصنف کوئی اسلوب اختیار کرتا ہے۔ مصنف نبض شناس بھی ہوتا ہے اور مخاطب کی نفسیات سے پوری طرح آگاہ بھی، اس لیے اسے یہ بھی پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے کہ مخاطب سماج کے کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے؟ اس کے انفرادی واجتماعی مسائل کیا ہیں؟ مصنف وہی اسلوب بروے کار لاتا ہے، جو مخاطب کے دل ودماغ پر اثر انداز ہو سکے۔ مصنف اگر ان باتوں کا خیال نہ

رکھے گا تو اس کی تحریروں تک مخاطب کی ذہنی رسائی نہ ہو سکے گی اور وہ اپنے مقصد، فن اور ابلاغ میں ناکام و نامراد ہوگا۔

مولانا مودودی کے مخاطب سماج کے ہر طبقے اور ہر معیار کے لوگ رہے ہیں۔ ان کے مخاطب کبھی علمائے کرام، کبھی اربابِ حکومت، کبھی مشاہیرِ وقت، کبھی گاؤں، دیہات کے سادہ لوح انسان اور کبھی جویائے علم و تحقیق بھی رہے ہیں۔ مولانا مودودی کو اپنے مخاطب کے ذہنی معیار، علمی استعداد اور نفسیات کا گہرا شعور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ عام خواندہ طبقے سے مخاطب ہوتے ہیں تو ان کا اندازِ بیان سادہ اور عام فہم ہو جاتا ہے، جب وہ طبقۂ اعلیٰ سے مخاطب ہوتے ہیں تو حکیمانہ نکتہ آرائی اور عالمانہ بصیرت افروزی سے کام لیتے ہیں۔

مولانا مودودی کی ہمہ جہت شخصیت کو علمی و مذہبی اور سنجیدہ ماحول، موضوعات کی رنگا رنگی، مقصد کی جہت اور مخاطب کی صلاحیت جیسے عناصر کی منضبط اور مربوط ترتیب و تنظیم نے ایک باوقار اسلوب عطا کیا ہے۔ اس اسلوب میں کون کون سی خوبیاں تھیں اور اس نے ترسیل و ابلاغ کی ذمہ داری کہاں تک ادا کی، اس کا تجزیہ کرنے سے قبل اردو کے نثری اسالیب کا جائزہ لینا ضروری ہے، جس کے پسِ منظر میں مولانا مودودی نے لکھنا شروع کیا۔

اردو کے نثری اسالیب

اردو اصنافِ نثر کی تاریخ مختلف اسالیب بیان اور بوقلموں خصوصیات سے عبارت ہے۔ سائنس، جدیدیت اور مابعدِ جدیدیت تک کے ادب میں معاشی و معاشرتی اور سیاسی و تمدنی میلانات نے نئے خیالات، نئی روشنی، نئے نظریات اور نئے افکار سے اردو نثر کے موضوع و مواد اور ہیئت و طرز بیان کو ہم آہنگ کر دیا ہے۔ ذیل میں اردو میں نثری اسالیب کی روایت کا مجمل جائزہ پیش کیا جا رہا ہے، جس کے پس منظر میں مولانا مودودی کے اسلوب کی تعمیر و تہذیب ہوئی ہے۔

اردو زبان و ادب کی نشو و نما اور ترویج و ترقی میں عرب تجّار اور صوفیائے کرام کی خدمات سے تمام اہلِ نظر واقف ہیں۔ ان کا مطمحِ نظر تبلیغ و اشاعتِ دین ہی تھا۔ تاہم اس کے لیے جس زبان کو وسیلۂ اظہار بنایا گیا وہ یہی اردو تھی، جس کی ترقی یافتہ شکل آج ہمارے سامنے ہے۔ ابتداءً ان لوگوں نے دینی تعلیمات کو اپنے مذہبی رسالوں میں عربی و فارسی سے ترجمہ کر کے اردو میں

شائع کیا۔ اس لیے ان ابتدائی نثر پاروں کے عمومی رجحان کا اثر اردو زبان و ادب پر بھی پڑا اور مذہبی نثر کی ابتدا ہوئی۔ قرنِ اول کی مذہبی نثر قدیم اردو نثر کے اولین نمونے ہیں۔ چوں کہ علماے کرام کے رسالوں، کتابوں اور ملفوظات کے مخاطب عوام تھے۔ اس لیے ان کے طرز بیان کا خارج از تکلف ہونا ناگزیر تھا۔ دوسری طرف، آسان لب و لہجے اور مؤثر انداز تخاطب کے لیے زبان کا صاف اور سادہ ہونا بھی اتنا ہی ضروری تھا۔ لہٰذا، جب ہم اس دور کی نثر کا جائزہ لیتے ہیں تو اس میں زبان کی سادگی، صفائی اور بے تکلفی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔

اردو نثر کے ارتقا میں ملا وجہی (سب رس) اور فضل علی فضلی (کربل کتھا) کی صالح کوششوں کا منفرد مقام ہے۔ ایک نے جنوب میں تو دوسرے نے شمال میں نثرِ اردو کے باغ لگائے۔ جنوب و شمال کے یہ دو اولین نثری نمونے اپنے اسلوب کی شگفتگی اور دل کشی، ایجاز و اختصار اور لسانی و ادبی اہمیت کے سبب تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ وجہی اور فضلی کے بعد میر عطا حسین خاں تحسین نے نوطرز مرصع میں عام مذاق کے مطابق پر تکلف، مقفیٰ اور مسجّع اور فارسی آمیز نثر لکھی۔ شاہ عبدالقادر کے ترجمۂ قرآن مجید اور ان شاء اللہ خاں انشا کی دریاے لطافت کو چھوڑ کر ۱۸۰۰ تک نثرِ اردو کی کوئی قابلِ ذکر تصنیف نہیں ملتی، جس نے اردو کے اسالیبِ بیان میں کوئی اضافہ کیا ہو۔

فورٹ ولیم کالج کے قلم کاروں نے روایت سے ہٹ کر عام فہم، سادہ و شگفتہ، دل چسپ اور دل نشیں اسلوب اختیار کیا۔ کالج کے اہم مصنفین میں میر امن (باغ و بہار) کا نام سرِفہرست ہے، جس نے اپنی منفرد طرز نگارش سے اردو نثر کی ایک نئی روایت قائم کی۔ اس کے برعکس دبستان لکھنؤ کے مصنفین نے طرزِ فورٹ ولیم کا مضحکہ اڑایا۔ جب کہ دہلی والے جلد ہی جادۂ اعتدال پر آ گئے۔ فسانۂ عجائب (رجب علی بیگ سرور) دراصل باغ و بہار کی سادگی و سلاست کے جواب میں مقفیٰ اور مسجّع عبارت میں لکھی گئی، جو لکھنوی طرزِ تحریر کی نمایندگی کرتی ہے۔

مکاتیبِ غالب سے اردو نثر کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ اِن مکاتیب میں غالب کی نجی زندگی اور ہندستان کی سیاسی و سماجی تاریخ ہی کا بیان نہیں ہے بلکہ یہ مکاتیب، میر امن کے بعد توضیحی و بیانیہ نثر اور سادہ و شگفتہ اور رواں اردو کے بہترین نمونے بھی ہیں اور یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ سر سید اور ان کے معاصرین کے علمی مقالات میں جو اسلوب ملتا ہے، اس کے ارتقا میں مکاتیبِ غالب نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

۱۸۵۷ کے سیاسی انقلاب نے اردو ادب اور متوسط طبقے کے طرزِ زندگی کو یک سر بدل دیا۔ چناں چہ ادب کو مختلف افکار و نظریات کا وسیلۂ اظہار بنایا گیا اور گہرے اور دقیق خیالات کی ترسیل کے لیے سادہ و سلیس نثر کی ضرورت پیش آئی۔ سر سید نے پیش قدمی کرتے ہوئے اردو میں سادہ و پرکار اور متین نثر لکھنے کی بنیاد ڈالی اور الطاف حسین حالی نے بھی اصولِ تنقید پر پہلی کتاب مقدمہ شعر و شاعری میں خیالات کی سادگی کے ساتھ ساتھ زبان کی سادگی پر بھی زور دیا، لیکن عبدالمغنی صاحب کے لفظوں میں 'ان کی نثر میں سادگی و سلاست کے باوجود، نہ صرف انگریزی الفاظ کا بے محابا استعمال روانیِ بیان میں خلل انداز ہوتا ہے بلکہ جا بجا ثقیل و نامانوس عربی الفاظ بھی عبارت کی سلاست کو مجروح کرتے ہیں۔' اس کے برعکس مولانا محمد حسین آزاد نے رنگین اور شگفتہ، دل کش اور شاعرانہ نثر لکھی اور الفاظ کے مناسب انتخاب، زبان کی شیرینی، تشبیہ و استعارے اور محاوروں سے سحر کاری کی۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں بھی روانی و تسلسل اور بے تکلفی و بے ساختہ پن ہے۔ ان کے طرز بیان میں سلاست، لچک اور مٹھاس بھی ہے۔ لیکن ان کے اظہار و بیان میں گہرائی و گیرائی نہیں ہے۔ بسا اوقات وہ خیالات کی رو میں بہہ جاتے ہیں، جس نے ان کے اسلوب میں نقص پیدا کر دیا ہے۔ علامہ شبلی کے یہاں بھی زبان و بیان کی صفائی و سادگی، فصاحت و بلاغت اور حکیمانہ استدلال و نفاست ہے۔ الغرض سر سید نے اردو میں جس اسلوبِ نثر کی بنیاد رکھی، اس پر ان کے رفقائے کار، حالی و شبلی اور نذیر و آزاد نے ایک شان دار عمارت تعمیر کی۔ سر سید مکتب فکر کے علاوہ جن صاحبِ طرز ادیبوں نے اردو نثر میں اپنی شناخت قائم کی ان میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا اور راشد الخیری کے نام خاص ہیں۔ ان میں سرشار کی طرزِ تحریر اپنی شوخی و ظرافت اور لکھنؤ کی بیگماتی زبان کے سبب اور سرشار کے ادبی حریف شرر کے یہاں مسلمانوں کی بیداریِ نو اور مغربی ادب سے تعلقِ خاص کی وجہ سے لافانی ہوگئی ہے۔ مرزا رسوا کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ ان کی طرزِ تحریر میں شیرینی و لطافت، نرمی اور گھلاوٹ اور طنز و مزاح نے ایک خاص آہنگ پیدا کر دیا ہے، جب کہ راشد الخیری نے عورتوں کی اصلاح و ترقی کو موضوع بناتے ہوئے دہلی کی پاکیزہ زبان استعمال کی۔ وہ حزن و ملال کے دل دادہ تھے، اس لیے یاسیت ان کے اسلوب کا ایک جزو بھی ہے۔ اس ضمن میں اودھ

پنچ کے منشی سجاد حسین کا ذکر بے محل نہ ہوگا، جو اپنی بے باکی، آزادیِ خیال، شوخی و بذلہ سنجی اور ضرب الامثال میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں کلاسیکی اور پھر رومانی تحریک نے بھی اردو کی نثری روایت میں 'ادبِ لطیف' کا اضافہ کیا۔ ان کے علم برداروں میں سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھ پوری، سجاد انصاری، قاضی عبدالودود وغیرہ جمالیاتی اقدار کے پرستار ہوئے۔ اس تحریک کے زیرِ اثر جس اسلوبِ بیان کو ترقی ملی، کہا جاسکتا ہے کہ اس کی مشترک صفت نفاست، لطافت اور دل کشی ہے۔

تعمیر اسلوب کے اعتبار سے مولانا مودودی کے معاصرین میں جنھیں امتیازی حیثیت رہی، ان میں خواجہ حسن نظامی، مولانا ابوالکلام آزادؔ، مولانا عبدالماجد دریابادی اور ابوالحسن علی ندوی کے نام اہم ہیں۔ موضوع و مواد اور دائرۂ کار کے اعتبار سے ان کے یہاں کئی خوبیاں قدرت مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر فکر و نظر کے اظہار و بیان کے لیے ان لوگوں نے جو جو اسلوب اختیار کیے وہ باہم مختلف ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کی تحریر میں دل کشی، بے تکلفی اور بے ساختگی کے ساتھ رجائیت، قنوطیت اور سوز و گداز بھی ہے۔ جب کہ مولانا آزاد کا شہرہ ان کے انانیتی ادب، بلند آہنگ نثر اور فلسفیانہ و مفکرانہ انداز بیان سے ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے یہاں دہلوی اور لکھنوی نثر کی خوبیاں ہم آمیز ہوکر ایک خوب صورت مرقع پیش کرتی ہیں، اور مولانا علی میاں کی طرزِ نگارش پر تاریخ و تصوف اور احیاے دین چھایا ہوا ہے۔ اس لیے ان کی زبان میں پختگی اور سنجیدگی کے ساتھ خوب صورت دردمندی بھی ہے۔

اردو کے نثری اسلوب کی تعمیر و ترقی میں ان صاحب طرز ادیبوں نے جو ادبی روایت قائم کی اس کے پس منظر میں مولانا مودودی کے قلم نے ضَو فشانیاں کیں۔ کسی ادیب کی طرز نگارش پر ماقبل اور ہم عصر اسلوبیاتی رجحانات کا بہ راہ راست اثر دیکھا جاسکتا ہے۔ مولانا مودودی ایک ذہین و فطین شخصیت تھے، اور صحافی و انشا پرداز ہونے کی حیثیت سے انھیں اردو ادب میں نثری میلانات کا گہرا شعور تھا۔ انھوں نے اپنے معاصرین کی طرزِ نگارش کو بھی پیشِ نظر رکھا، اور نثرِ اردو کے اسلوبی پسِ منظر سے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر استفادہ کیا ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بنیادی طور پر ایک صاحبِ طرز ادیب تھے اور ماقبل پیش کی گئی

تفصیل کے تناظر میں ان کا ایک منفرد اسلوب تھا، جو مختلف تصنیفات میں بہ تقاضاے ضرورت مختلف انداز میں اجاگر ہوتا رہا۔ ان کے اسلوب کی گہری چھاپ ان کی تمام تحریروں میں نظر آتی ہے۔ بالخصوص، اپنی اہم تصنیفات الجہاد فی الاسلام، تفہیم القرآن، پردہ، اسلامی تہذیب کے اصول ومبادی، تنقیحات، تفہیمات، دینیات، خطبات، سیرت سرورِ عالمؐ، سود اور مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش وغیرہ میں انھوں نے اپنے منفرد اسلوب کی ضیا پاشی کی ہے۔ ان کے مکاتیب ان پر مستزاد ہیں، جو اپنی سادگی و شگفتگی اور ظرافت کے اعتبار سے بہ طور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں۔ چوں کہ سید مودودی کی شخصیت مختلف حیثیات کی حامل اور مرتب شخصیت تھی، اس لیے ہر تحریر ان کے مزاج ومیلانات کا آئینہ نظر آتی ہے۔

ایک صاحبِ طرز ادیب کی کام یابی کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ تحریر کی ابتدا ہی سے قاری کے ذہن ودل کو اپنی گرفت میں لے لے۔ مولانا مودودی کے طرز نگارش کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنی تحریر کی ابتدا ہی میں قاری کو اپنے طرزِ استدلال اور قوتِ تاثیر سے اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں اور جس طرح چاہتے ہیں، لے جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں افسانویت یا ڈرامائیت نہیں ہوتی بلکہ وہ سنجیدہ شعور کی حامل ہوتی ہیں۔ ذیل کے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں، جو اپنی کشش اور دل چسپ اندازِ بیان کی وجہ سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ ان اقتباسات میں ان کا مخصوص طرزِ تحریر واضح ہو گیا ہے:

> ۱- انسانی تمدن کے سب سے مقدم اور سب سے زیادہ سنجیدہ مسئلے دو ہیں، جن کے صحیح اور متوازن حل پر انسان کی فلاح وترقی کا انحصار ہے، اور جن کو حل کرنے میں قدیم ترین زمانے سے لے کر آج تک دنیا کے حکما وعقلا پریشان وسرگرداں رہے ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں مرد اور عورت کا تعلق کس طرح قائم کیا جائے کیوں کہ یہی تعلق دراصل تمدن کا سنگِ بنیاد ہے، اور اس کا حال یہ ہے کہ اگر اس میں ذرا سی بھی کجی آجائے تو:
>
> تاثریا می رود دیوار کج
>
> اور دوسرا مسئلہ فرد اور جماعت کے تعلق کا ہے، جس کا تناسب قائم کرنے میں ذرا سی بے اعتدالی بھی باقی رہ جائے تو صدیوں تک عالم انسانی کو اس کے تلخ نتائج بھگتنے پڑتے ہیں(۱)

---

(۱) پردہ، ص ۱۳۔

۲- انسانی تمدّن کی بنیاد جس قانون پر قائم ہے اس کی سب سے پہلی دفعہ یہ ہے کہ انسان کی جان اور اس کا خون محترم ہے۔ انسان کے تمدّنی حقوق میں اوّلین حق زندہ رہنے کا حق ہے اور اس کے تمدنی فرائض میں اولین فرض زندہ رہنے دینے کا فرض ہے۔ دنیا کی جتنی شریعتیں اور مہذب قوانین ہیں ان سب میں احترامِ نفس کا یہ اخلاقی اصول ضرور موجود ہے۔ ہر شخص کی عقل خود سمجھ سکتی ہے کہ اگر انسان کی جان کی کوئی قیمت نہ ہو، اس کا کوئی احترام نہ ہو، اس کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہ ہو، تو چار آدمی کیسے مل کر رہ سکتے ہیں، ان میں کس طرح باہم کاروبار ہوسکتا ہے، انھیں وہ امن و اطمینان اور وہ بے خوفی و جمعیتِ خاطر کیوں کر حاصل ہوسکتی ہے، جس کی انسان کو تجارت، صنعت اور زراعت کرنے، دولت کمانے، گھر بنانے، سیر وسفر کرنے اور متمدن زندگی بسر کرنے کے لیے ضرورت ہوتی ہے[۱]؟

مندرجہ بالا اقتباسات میں پہلا اقتباس پردہ سے اور دوسرا الجہاد فی الاسلام سے ماخوذ ہے۔ ان تمہیدوں کے مطالعے سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا مودودی نے قاری کی توجہ کس حکیمانہ انداز سے اپنی طرف مبذول کرلی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے گویا اس تمہید کے ذریعے وہ قاری کے ذہن کو غور وفکر کے لیے تیار کر رہے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی تحریروں کے دھارے میں قاری شعوری طور پر بہتا چلا جاتا ہے۔ قاری کا یہی بہاؤ اور بالآخر گرویدگی، مولانا مودودی کی نثر کی امتیازی صفت ہے۔

جس طرح مولانا مودودی اپنے مضامین کے آغاز ہی میں زیر بحث موضوع کی جملہ کیفیات کو نچوڑ کر قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، اسی طرح ان کے مضامین کا اختتامیہ بھی بڑا پرکشش اور فیصلہ کن ہوا کرتا ہے۔ اس میں عام طور پر مضمون کے تمام اجزا کی ترجمانی اور تکمیل ہوجاتی ہے، اور مسئلہ زیرِ بحث نقطۂ انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ مولانا اپنے خیالات کو مخصوص تنقیدی و تاثراتی انداز سے پیش کرکے قاری کے ذہن و دماغ کے لیے عبرت و بصیرت اور اثر انگیزی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ ذیل کے دو اقتباسات سے مولانا کے اسلوب تحریر کو بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے:

۱- ایک ایسی مجاہد و مجتہد جماعت اگر مسلمانوں میں پیدا ہوجائے تو مسلمان تمام دنیا کے پیشوا بن سکتے ہیں۔ ان کو وہی مقامِ عزت پھر مل سکتا ہے، جس پر وہ کبھی سرفراز تھے

(۱) الجہاد فی الاسلام، ص ۲۳۔

اور جس پر مغربی قوموں کو متمکن دیکھ کر آج ان کے منہ میں پانی بھرا چلا آرہا ہے۔لیکن اگر اس قوم کے جمہور اسی طرح دون ہمتی و پست حوصلگی کے ساتھ بیٹھے رہے، اگر اس کے نوجوان یوں ہی غیروں کا پس خوردہ کھانے کو اپنا منتہاے کمال سمجھتے رہے، اگر اس کے علما اپنی انھی پرانی فقہ و کلام کی فرسودہ بحثوں میں الجھے رہے، اگر ان لیڈروں اور سیاسی پیشواؤں کی ذلیل ذہنیت کا یہی حال رہا کہ لشکرِ اغیار کے پیچھے لگ چلنے کو مجاہدانہ عزیمت کا بلندترین مرتبہ سمجھیں اور بیسویں صدی کے سب سے بڑے فریب میں اپنی قوم کو مبتلا کرنا کمال دانش مندی خیال کریں......غرض، اگر اس قوم کے دست و پا سے لے کر دل و دماغ تک سب کے سب تعطل یا خام کاری ہی میں گرفتار رہیں اور اس کروڑوں کے انبوہ سے چند مردانِ خدا بھی جہاد اور اجتہاد فی سبیل اللہ کے لیے کمر باندھ کر نہ اٹھ سکیں تو پھر دنیا جس اسفل السافلین کی طرف جارہی ہے اسی طبقۂ جہنم میں یہ قوم بھی دنیا کی دُم کے ساتھ بندھی بندھی جا گرے گی اور غضبِ خداوندی ایک مرتبہ پھر پکارے گا: اَلاَ بُعْدًا لِّقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۔(۱)

۲- علمی و عقلی حیثیت سے اس نظریے میں جو کم زوریاں ہیں، ان سے قطعِ نظر کر کے اگر دیکھا جائے کہ فلسفہ اور اخلاق اور علوم تمدن و اجتماع میں داخل ہو کر اس ظالم تخیل نے انسان کو برباد کرنے کے لیے کیسے شدید فتنے برپا کیے ہیں، تو شاید کسی صاحبِ بصیرت آدمی کو یہ ماننے میں ذرہ برابر تامل نہ ہوگا کہ موجودہ دور میں جن نظریات نے انسان کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کی ہے، ان میں ڈارونیت ان سب کی سرتاج ہے۔اس نے انسان کو یقین دلایا ہے کہ تو جانوروں میں سے بس ایک جانور ہے۔ پھر یہ ڈارون ہی کا نظریہ ہے کہ جس نے انسان کے سامنے پورے نظام کائنات کو ایک رزم گاہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے، اور اس کو بتایا ہے کہ نزاع اور جنگ اور کش مکش ہی اصل تقاضاے فطرت ہے۔اس کش مکش میں جو زور آور ہے وہی زندہ اور کام یاب ہے، اور وہی صالح اور برحق ہے۔ بہ خلاف اس کے، جو کم زور ہے وہی غیر صالح اور اس کا مٹنا اور فنا ہو جانا قوانینِ فطرت کا ایک ایسا نتیجہ ہے، جس کو برحق ہونا ہی چاہیے۔ آج یہ اسی طرزِ فکر کی برکات ہیں کہ انسانی افراد سے لے کر طبقات، اقوام اور ممالک تک سب کے سب دنیا کو حقیقت میں ایک رزم گاہ بنائے ہوئے ہیں اور فطرت کا تقاضا انھوں نے یہی سمجھا ہے کہ جو طاقت ور ہے وہ کم زور کو فنا کر دے گا۔(۲)

---

(۱) تنقیحات، ص ۹۴، ۹۵۔

(۲) تفہیمات دوم، ص ۲۸۳، ۲۸۴۔

مندرجہ بالا اقتباسات مولانا مودودی کے دو تنقیدی مضامین (’لارڈ لوتھین کا خطبہ‘ اور ’ڈارون کا نظریۂ ارتقا‘) سے ماخوذ ہیں۔ پہلے اقتباس میں انھوں نے مسلمانوں کی پیرویِ مغرب پر سخت تنقید کرتے ہوئے اس کے فرضِ منصبی کی یاددہانی کرائی ہے، اور دوسرے اقتباس میں ڈارون کے نظریۂ ارتقا پر تند و تیز نشتر چلاتے ہوئے اسے ظالم اور انسان دشمن نظریہ ثابت کیا ہے۔ ان اقتباسات کے مطالعے کے بعد اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا موصوف کی شخصیت انسان دوستی اور جذبۂ ملی سے کس قدر سرشار تھی۔ حکمت و دانائی کے ساتھ مسلمانوں میں بصیرت افروزی اور احیاے ملت کا یہی جذبہ وفکر ان کی تمام نثری کاوشوں کا مشترک وصف ہے۔

اس حوالے سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان تمام عبرت اندوزی اور بے پناہ جذبات و خیالات کو زبان کا جامہ پہنانے کے لیے مولانا نے مناسب اور موزوں ترین طرزِ تخاطب اور الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔ کہیں مترادفات کا استعمال کر کے تاثیرِ کلام میں اضافہ کیا ہے اور کہیں محاورے اور تکرارِ الفاظ کے ذریعے معنیِ کلام میں زور واثر پیدا کیا گیا ہے۔ کہیں طنز کے سریع الاثر نشتر چلائے ہیں اور کہیں سوز و عبرت کا سامان بھی پیدا کر دیا ہے۔ اور، ان سب کے علاوہ، منقولہ اقتباسات میں زبان کی صفائی اور پاکیزگی اور سادہ و شگفتہ اندازِ بیان، ان کے اسلوبِ تحریر کی آئینہ داری کر رہی ہے۔

کلام میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے اور زیرِ بحث موضوع کی توضیح و تشریح کے لیے مثالوں کا استعمال بڑا کارگر طریقہ ہے۔ مولانا مودودی نے اس طریقِ کار کو بھی بڑی کام یابی سے متعدد مقامات پر اختیار کیا ہے۔ مثالوں کے استعمال میں انھیں بڑی مہارت حاصل ہے۔ آسان اور قریب الفہم مثالوں کے ذریعے انھوں نے ادق سے ادق موضوعات و مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھیں نفسیاتِ انسانی کا گہرا شعور تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ بڑی ہنرمندی سے سازِ دل کو چھیڑنے میں کام یاب ہوئے ہیں۔ یہ مثالیں، جہاں ایک طرف مسئلہ وموضوع اور اثر انگیزی میں معاون کردار ادا کرتی ہیں، وہیں دوسری طرف یہ مولانا کی ذہانت و فطانت اور نبض شناسی کی بہترین عکاسی بھی کرتی ہیں۔ صرف دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱- جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے۔ اگر

دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکھن نکلے گا، قدرتی بات ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہوگا۔ اسی طرح اگر سوسائٹی بگڑی ہوئی ہو تو اس کے ووٹوں سے وہی لوگ منتخب ہوکر برسرِ اقتدار آئیں گے جو اس سوسائٹی کی خواہشاتِ نفس سے سندِ قبولیت حاصل کر سکیں گے۔ پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں گے اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے گا تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی۔ ان کا گمان غلط ہے۔(۱)

۲۔ جو شخص اپنے اوقات میں سے تھوڑا سا وقت خدا کو پوجنے کے لیے الگ کرتا ہے اور اس تھوڑے سے وقت میں عبادت کے چند مخصوص مراسم ادا کر دینے کے بعد یہ سمجھتا ہے کہ میں نے خدا کا حق ادا کر دیا ہے، اب میں آزاد ہوں کہ اپنی زندگی کے معاملات کو جس طرح چاہوں انجام دوں، اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی ملازم جسے آپ نے رات دن کے لیے نوکر رکھا ہو اور جسے پوری تنخواہ دے کر آپ پرورش کر رہے ہوں، وہ بس صبح و شام آکر آپ کو جھک جھک کر سلام کر دیا کرے اور اس کے بعد آزادی کے ساتھ جہاں چاہے کھیلتا پھرے یا جس جس کی چاہے نوکری بجالائے۔ اسی طرح جو شخص دنیا اور اس کے معاملات سے الگ ہوکر ایک گوشے میں جا بیٹھتا ہے اور اپنا سارا وقت نماز پڑھنے، روزے رکھنے، قرآن پڑھنے اور تسبیح پھیرنے میں صرف کر دیتا ہے، اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جسے آپ باغ کی رکھوالی کے لیے مقرر کریں مگر وہ باغ کو اور اس کے کام کاج کو چھوڑ کر آپ کے سامنے ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑا رہے۔ صبح سے شام اور شام سے صبح تک آقا آقا پکارتا رہے اور باغ بانی کے متعلق جو ہدایات آپ نے اسے دی ہیں ان کو خوش الحانی اور ترتیل کے ساتھ پڑھتا ہی رہے لیکن باغ کی اصلاح و ترقی کے لیے کام ذرا نہ کر کے دے۔ ایسے ملازموں کے متعلق جو کچھ رائے آپ قائم کریں گے وہی رائے اسلام بھی ایسے عبادت گزاروں کے متعلق قائم کرتا ہے۔(۲)

مولانا مودودی نے اپنے جذبات وخیالات اور افکار ونظریات کے اظہار وابلاغ کے لیے اردو نثر کو وسیلہ بنایا تھا، اس کے لیے اظہار و بیان کا فرسودہ اور غیر مروّج اسلوب بے سود ہوتا ہے۔ اس لیے انھوں نے علمی اور حکیمانہ اندازِ بیان اور طرزِ استدلال اختیار کیا، جس میں نہ تکلف

(۱) مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش، سوم، ص ۱۰۷۔

(۲) اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر، ص ۹، ۱۰۔

ہے نہ تصنع، نہ لفظی بازی گری اور نہ عبارت آرائی، بلکہ نہایت سلیقہ وصفائی کے ساتھ معنیِ کلام میں حسن و دل کشی اور نکتہ آرائی کی گئی ہے۔ اس میں منطق واستدلال کا ایسا زور پایا جاتا ہے جو قاری کے ذہن ودماغ میں بصیرت اور روشنی بھر دیتا ہے۔ طرز مودودی کا یہی وصف انھیں دیگر اربابِ قلم سے ممتاز کرتا ہے۔ ذیل میں اس منفرد اسلوب کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

> دوسری چیز احسان ہے، جس سے مراد نیک برتاؤ، فیاضانہ معاملہ، ہمدردانہ رویہ، رواداری، خوش خلقی، باہمی مراعات، ایک دوسرے کا پاس ولحاظ، دوسرے کو اس کے حقوق سے کچھ زیادہ دینا، اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر راضی ہوجانا۔ یہ انصاف سے زائد ایک چیز ہے، جس کی اہمیت اجتماعی زندگی میں عدل سے بھی زیادہ ہے۔ عدل اگر معاشرے کی اساس ہے تو احسان اس کا جمال اور کمال۔ عدل اگر معاشرے کو ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوش گواریاں اور شیرینیاں پیدا کرتا ہے۔ کوئی معاشرہ صرف اس بنیاد پر کھڑا نہیں رہ سکتا کہ اس کا ہر فرد ہر وقت ناپ تول کر دیکھتا رہے کہ اس کا کیا حق ہے، اور اسے وصول کر کے چھوڑے، اور دوسرے کا کتنا حق ہے اور اسے بس اتنا ہی دے دے۔ ایسے ایک ٹھنڈے اور کھرے معاشرے میں کش مکش تو نہ ہوگی مگر وہ محبت اور شکر گزاری اور عالی ظرفی اور ایثار اور اخلاص وخیر خواہی کی قدروں سے محروم رہے گا، جو دراصل زندگی میں لطف وحلاوت پیدا کرنے والی اور اجتماعی محاسن کو نشوونما دینے والی قدریں ہیں۔(۱)

تشبیہات واستعارات اگرچہ بنیادی طور پر شعری اسلوب کے وسائل ہیں لیکن ادبی نثر میں اس کا استعمال اس کے حسن ورعنائی میں مزید دل کشی پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ ان کی بہترین مثال مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر ہے۔ مولانا مودودی نے اپنی تحریروں میں ابلاغِ خیال اور ترسیلِ افکار کے لیے اپنے علمی مقالوں اور تفسیری کاوشوں میں حسبِ ضرورت تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا ہے۔ ان کی یہ تشبیہات اور استعارے دراصل قرآن کے ادبی اعجاز کا فیضان ہیں۔ اس کے استعمال نے ان کی عبارتوں کو معنی خیزی اور سحر انگیزی عطا کی ہے۔ ان کی نثر سے تشبیہات واستعارات کی ایسی صرف ایک مثال پیش کی جارہی ہیں، جس نے ان کی نثر کے وقار، متانت اور قطعیت میں اضافہ ہی کیا ہے:

---

(۱) معاشیات اسلام، ص ۱۶۸، ۱۶۹۔

سرمایہ داری کا اقتضا یہ ہے کہ روپیہ جمع کیا جائے اور اس کو بڑھانے کے لیے سود لیا جائے تاکہ ان نالیوں کے ذریعے آس پاس کے لوگوں کا روپیہ بھی سمٹ کر اس جھیل میں جمع ہو جائے۔ اسلام، اس کے بالکل خلاف یہ حکم دیتا ہے کہ روپیہ اول تو روک کر نہ رکھا جائے، اور اگر رُک گیا ہو تو اس تالاب میں سے زکوٰۃ کی نہریں نکال دی جائیں، تاکہ جو کھیت سوکھے ہیں، ان کو پانی پہنچے اور گرد و پیش کی ساری زمین شاداب ہو جائے۔(۱)

مولانا مودودی کے اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت سادگی و سلاست ہے۔ وہ بنیادی طور پر سادہ و سلیس اور شایستہ و نفیس نثر استعمال کرتے ہیں۔ اسلوب کا یہ حسن ان کی ابتدائی تحریروں میں جلوہ افروز تھا، اور بعد کی تحریروں میں یہ حسن پوری طرح نکھر کر دو آتشہ بن گیا ہے۔ مشکل عربی و فارسی الفاظ، ادق اور نامانوس ترکیبیں اور طول طویل جملوں سے احتراز نے ان کی تحریروں کو آسان اور قابلِ فہم بنا دیا ہے۔ دینیات، خطبات، سیرتِ سرورِ عالمؐ اور تفہیم القرآن اس اسلوب کی زندہ و عمدہ مثالیں ہیں۔ دینیات کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے، جس میں انھوں نے بڑی لطافت سے سادہ الفاظ کے ذریعے ایک خیال کو قاری کے دل و دماغ میں اتارنے کی کوشش کی ہے:

تم دیکھتے ہو کہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں، سب ایک قاعدے اور قانون کی تابع ہیں۔ چاند اور تارے سب ایک قاعدے میں بندھے ہوئے ہیں، جس کے خلاف وہ بال برابر جنبش نہیں کر سکتے۔ زمین اپنی خاص رفتار کے ساتھ گھوم رہی ہے۔ اس کے لیے جو وقت اور رفتار اور راستہ مقرر کیا گیا ہے اس میں ذرا فرق نہیں آتا۔ پانی اور ہوا، روشنی اور حرارت، سب ایک ضابطے کے پابند ہیں۔ جمادات و نباتات اور حیوانات میں ہر ایک کے لیے جو قانون مقرر ہے، اسی کے مطابق یہ سب پیدا ہوتے ہیں، بڑھتے ہیں اور گھٹتے ہیں، جیتے ہیں اور مرتے ہیں۔ خود انسان کی حالت پر تم غور کرو گے تو تم کو معلوم ہوگا کہ وہ بھی قانونِ قدرت کا تابع ہے۔ جو قاعدہ اس کی زندگی کے لیے مقرر کیا گیا ہے، اسی کے مطابق سانس لیتا ہے، پانی اور غذا اور حرارت اور روشنی حاصل کرتا ہے۔ اس کے دل کی حرکت، اس کے خون کی گردش، اس کی سانس کی آمد و رفت اسی ضابطے کی پابند ہیں۔ اس کا دماغ، اس کا معدہ، اس کے پھیپھڑے، اس کے اعصاب اور عضلات، اس کے ہاتھ، پاؤں، زبان، آنکھیں، کان اور ناک، غرض اس

(۱) سود، ص ۴۴۔

کے جسم کا ایک ایک حصہ وہی کام کر رہا ہے جو اس کے لیے مقرر ہے اور اس طریقے پر کام کر رہا ہے جو اس کو بتا دیا گیا ہے۔(۱)

مولانا مودودی کی نثر میں سادگی کے ساتھ سنجیدگی اور سلاست کے ساتھ روانی، ان کی شخصیت کی بہترین ترجمانی کرتی ہے۔ ان کے اسلوب میں وضاحت وصراحت اور اثر انگیزی اور معانی آفرینی قرآن پاک کے ترجموں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے، جس میں انھوں نے عربِ مبین کی ترجمانی اردوے مبین میں کرنے کی کام یاب کوشش کی ہے۔ ترجمے سے صرف ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں بے شمار نشانیاں ہیں۔ ایمان لانے والوں کے لیے۔ اور تمھاری اپنی پیدایش میں، اور ان حیوانات میں جن کو اللہ (زمین میں) پھیلا رہا ہے، بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین لانے والے ہیں، اور شب و روز کے فرق واختلاف میں، اور اس رزق میں جسے اللہ آسمان سے نازل فرماتا ہے، پھر اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو جلا اٹھاتا ہے، اور ہواؤں کی گردش میں بہت سی نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیاں ہیں جنھیں ہم تمھارے سامنے ٹھیک ٹھیک بیان کر رہے ہیں۔ اب، آخر، اللہ اور اس کی آیات کے بعد اور کون سی بات ہے، جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے؟(۲)

مولانا کے اس اقتباس میں سادگی، سلاست اور پرکاری کی انتہا ہے، مگر سنجیدہ لب ولہجہ ہر جگہ برقرار ہے۔ صاف وصریح اور پرتاثیر طرزِ اظہار کی وجہ سے عبارت میں تخلیقیت اور روانی پیدا ہوگئی ہے۔ یہ عبارت عربی الفاظ کے شکوہ وعظمت کو اردوے مبین میں منتقل کرنے کی عمدہ مثال ہے۔ مولانا کے اس اسلوبِ ترجمہ کا ذکر کرتے ہوئے ممتاز محقق اور نقاد پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

اس کی فصاحت وبلاغت، سلاست ونفاست، لطافت ودبازت اور پختگی وشگفتگی اردو کے نثری ادب میں بے نظیر ہے۔(۳)

مولانا مودودی کے اسلوب کی سادگی وصفائی اور سلاست وروانی اردو کے اسلوبِ بیان میں ایک قیمتی اور قابل قدر اضافہ ہے۔ انھوں نے مشکل اور پیچیدہ دینی وسیاسی، اقتصادی ومعاشرتی اور ملکی وعالمی مسائل ومباحث کو جس سادہ اور آسان پیرایے میں بیان کیا ہے، اور بڑی

(۱) دینیات، ص ۱۰-۱۲۔
(۲) ترجمۂ قرآن مجید، مولانا مودودی، الجاثیہ: ۳-۶، ص ۱۲۵۵-۱۲۵۷۔
(۳) مولانا مودودی کی ادبی خدمات، ص ۳۸۔

بڑی گتھیوں کو سلجھایا ہے، یہ ان ہی کا حصہ ہے۔ مولانا کے اس اندازِ تحریر اور طرزِ اظہار کی سب سے بڑی خصوصیت ڈاکٹر وحید قریشی کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

> مشکل مسائل کو سیدھے سادے انداز میں پیش کرنے کا جو ڈھنگ انھیں آتا ہے، اس سے ان کی نثر ایک عام قاری کو بھی اپنی طرف اسی شدت سے کھینچتی ہے، جس شدت سے ایک عالم کو۔ انھوں نے ہماری اردو نثر کی روایت میں یہ انقلابی تبدیلی پیدا کی ہے کہ اسے دینی نثر کے عام اسلوب سے الگ کر کے عام پڑھنے والوں کے لیے ایک گونہ سہولت پیدا کر دی ہے۔ اردو ادب میں دینی سرمایے کو بیان کرنے کے لیے جو عربی آمیز ڈھنگ اختیار کیا گیا اس میں خاص طرح کا مولویانہ رنگ نمایاں رہا ہے، لیکن مولانا کی نثر میں ایک ادبی شان پائی جاتی ہے۔ وہ بلاشبہ اردو کے ایک صاحبِ طرز نثر نگار تھے۔(۱)

مولانا مودودی کے اسلوب میں زبان کی کرختگی اور اظہار کی ثقالت نہیں ہے۔ ان کی تحریروں کو پڑھتے وقت قاری ہیجانی کیفیت میں مبتلا نہیں ہوتا ہے۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی طبیعت میں سادگی وصفائی اور شخصیت میں شفافیت بہ درجۂ اتم موجود ہے۔ اس لیے اس شخصیت سے پھوٹنے والا اسلوب بھی سادہ اور صاف وشفاف ہے۔ لیکن اس سادگی میں اُبلی کھچڑی اور بے نمک سالن کا ذائقہ نہیں ہے، بلکہ اس میں جودت وندرت ہے اور ایسا بانکپن ہے جو کوششِ پیہم اور شخصیت کی منفرد تعمیر وتہذیب ہی کے نتیجے میں ظہور کرتا ہے۔

مولانا مودودی کے اسلوب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے جس موضوع پر لکھا ہے۔ اس کے لیے مناسب اور موزوں طرزِ اظہار بھی اختیار کیا ہے۔ مثلاً: فلسفہ وعمرانیات جیسے ادق موضوعات پر لکھتے ہوئے انھوں نے خالص علمی ومنطقی انداز اختیار کیا ہے۔ اس کے لیے الجہاد فی الاسلام، اسلامی تہذیب کے اصول ومبادی، پردہ وغیرہ قابلِ ذکر کتب ہیں۔ اسی طرح تاریخی ومذہبی کتابوں کا ترجمہ کرتے وقت انھوں نے اصل مصنّفین اور متن وعبارت کے دوش بہ دوش چلنے کی کام یاب کوشش کی ہے۔ مثلاً ترجمۂ قرآن مجید، Legacy of Islam وغیرہ۔ ٹھیٹھ علمی مضامین اور دینی وملّی مسائل ومباحث کے لیے انھوں نے سنجیدہ اور باوقار طرزِ استدلال اختیار کیا ہے۔ مثلاً: تفہیمات، تنقیحات، مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش، قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، سنت کی آئینی حیثیت وغیرہ۔

---

(۱) ماہ نامہ سیارہ، لاہور، اپریل، مئی ۱۹۸۰ء، ص ۶۲۔

مولانا مودودی نے اپنے جس قلم سے نہایت سادہ و سلیس اور سنجیدہ و متین نثر کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں، وہی قلم شگفتہ نگاری پر بھی پوری قدرت رکھتا تھا۔ شگفتہ نگاری اگرچہ ان کی سادگی و پرکاری اور طنزیات کے مقابلے میں مقدار کے اعتبار سے بہت کم ہے، لیکن معیار کے اعتبار سے قابلِ توجہ اور نہایت دل چسپ ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ان کی طنز نگاری (جس کا جائزہ آگے آئے گا) یا شگفتہ نگاری اخلاقی حدود سے کبھی باہر نہیں نکلتی۔ مولانا کی شگفتہ نگاری کے جوہر بالخصوص ان کے ایسے مضامین اور مکتوبات میں سامنے آتے ہیں، جن میں انھوں نے نہایت بے تکلفی اور قرب و یگانگت کا اظہار کیا ہے۔ یوں موضوع چاہے جو کچھ بھی ہو، ان کا باغ و بہار قلم شگفتگی اور شادابی کے لیے اپنی راہ کھوج لیتا ہے اور پھر اسے پڑھتے ہوئے ہر قاری صحرا میں بھی شادابیِ چمن کا لطف اٹھاتا ہے۔ تحریر کی یہ شگفتگی اور شادابی زیادہ تر ان کے مکتوبات میں نمایاں ہوئی ہیں، جہاں وہ بے تکلف دوستوں سے ہم کلام ہوئے ہیں۔ ایسے میں ان کی رعایتِ لفظی اور معنی آفرینی کا جوہر بھی پوری طرح نمایاں ہوجاتا ہے۔ ان کے مکتوبات سے صرف دو اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ۱- میں چوں کہ بے ہمہ ہوں، اس لیے خدا نے مجھے باہمہ بھی بنا دیا ہے۔ سخت قسم کے دہریے اور کمیونسٹ بھی مجھ سے اسی طرح ملتے ہیں، جس طرح مومنین صادقین۔ اور لوگوں سے بات چیت کرنے میں ایسی جگہ آسانی رہتی ہے، جہاں وہ شخصیتیں نہ ہوں جن سے یہ لوگ باتکلف گفتگو کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔(۱)
>
> ۲- اس حالت میں آپ لوگ میرے بچے کھچے وقت پر بھی چھاپے مارنے کی اسکیمیں بناتے رہتے ہیں۔ بہ راہِ کرم میرے اوپر مزید بار ڈالنے کی اب کوشش نہ کریں ورنہ اس کے نیچے بالکل دب کر رہ جانے کا خدشہ ہے۔(۲)

مولانا مودودی بنیادی طور سے ایک نثر نگار اور انشا پرداز تھے۔ انشا پرداز ایسے، جو نثری ادب کے تمام اسالیب پر مکمل دسترس رکھتا ہو۔ انھوں نے اردو کے مذہبی و سیاسی اور

---

(۱) خطوطِ مودودی، حصہ دوم، ص ۲۶۲۔

(۲) خطوطِ مودودی، حصہ دوم، ص ۴۴۸۔

تاریخی وثقافتی ادب پر اپنے منفرد طرز واسلوب کے لافانی نقوش ثبت کیے ہیں۔انھوں نے اردو زبان میں مذہبی نثر کی نئی طرح ڈالی اور اسے دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق آراستہ کیا ہے۔ بیسویں صدی کے چند صاحبانِ اسلوب میں مولانا موصوف ان خاص نثر نگاروں میں ہیں جن کی آواز وانداز کو دور ہی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ان کی اس آواز میں سوز جگر بھی ہے اور تازگی وتوانائی بھی۔شفقت ورحمت بھی اور عبرت ونصیحت بھی ہے۔انھوں نے خالص دینی ومذہبی موضوعات میں بھی فصاحت وبلاغت اور سلاست وادبیت کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ان کے یہاں جذبہ و احساس اور فکر وخیال میں توازن اور آہنگ ہے۔ان کے انداز وادا میں ترتیب وتہذیب اور کلام میں ربط ونظم عبارت کو دل کش اور دل نواز بنا دیتا ہے۔صرف ایک اقتباس ملاحظہ کریں، جوان کے خلوص جذبہ وفکر اور دل نشیں اندازِ بیان کا ترجمان ہے:

> قرآن کی سطروں کے نیچے آدمی کو ایک ایسی بے جان عبارت ملتی ہے جسے پڑھ کر نہ اس کی روح وجد میں آتی ہے، نہ اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، نہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں، نہ اس کے جذبات میں کوئی طوفان برپا ہوتا ہے، نہ اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز عقل وفکر کو تسخیر کرتی ہوئی قلب وجگر تک اترتی چلی جارہی ہے۔اس طرح کا تأثر رونما ہونا تو درکنار، ترجمے کو پڑھتے وقت تو بسا اوقات آدمی یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ کیا واقعی یہی وہ کتاب ہے، جس کی نظیر لانے کے لیے دنیا بھر کو چیلنج دیا گیا تھا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظی ترجمے کی چھلنی صرف دوا کے خشک اجزا ہی کو اپنے اندر سے گزرنے دیتی ہے۔رہی ادب کی وہ تیز وتند اسپرٹ جو قرآن کی اصل عبارت میں بھری ہوئی ہے، اس کا کوئی حصہ ترجمے میں شامل نہیں ہونے پاتا۔وہ اس چھلنی کے اوپر ہی سے اڑ جاتی ہے۔حالاں کہ قرآن کی تاثیر میں اس کی پاکیزہ تعلیم اور اس کے عالی قدر مضامین کا جتنا حصہ ہے، اس کے ادب کا حصہ بھی اس سے کچھ کم نہیں ہے۔یہی تو وہ چیز ہے جو سنگ دل سے سنگ دل آدمی کا دل بھی پگھلا دیتی تھی، جس نے بجلی کے کڑکے کی طرح عرب کی ساری زمین ہلا دی تھی، جس کی قوتِ تاثیر کا لوہا اس کے شدید ترین مخالفین تک مانتے تھے، اور ڈرتے تھے کہ یہ جادو اثر کلام جو سنے گا وہ بالآخر نقدِ دل ہار بیٹھے گا۔یہ چیز اگر قرآن میں نہ ہوتی، اور وہ اسی طرح کی زبان

میں نازل ہوا ہوتا جیسی اس کے ترجموں میں ہم کو ملتی ہے تو اہل عرب کے دلوں کو گرمانے اور نرمانے میں اسے ہرگز وہ کام یابی نہ حاصل ہوسکتی جو فی الواقع اسے حاصل ہوئی۔(۱)

محولہ بالا اقتباس روانیِ عبارت، زورِ بیان اور بلاغتِ زبان کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ عبارت صاف وصریح، الفاظ واضح اور منتخب ہیں۔ اس میں کوئی اشکال، ابہام یا پیچیدگی نہیں بلکہ تشبیہ و استعارے، محاورے اور مترادفات مرکب ہوکر ایک لطیف و نفیس اور تخلیقی نثر کی بہترین مثال پیش کرتے ہیں۔

مولانا مودودی کے نثری سرمایے میں کہیں کہیں طنز وظرافت کا رنگ بھی ملتا ہے۔ مولانا کی ذہانت ان کی تحریروں میں بڑے لطیف طنز اور ظرافت کے شگوفے پیدا کر دیتی ہے۔ ان کی طنز کا دائرہ مقامی، ملکی اور بین الاقوامی معاملات تک پھیلا ہوا ہے۔ مغربی تہذیب سے مرعوبیت یا پیرویِ مغرب ان کے یہاں نہیں ہے۔ ان کی آنکھیں ظاہری چکا چوند سے متاثر نہیں ہوتیں۔ وہ باطنی اخلاق و خصائل کے دل دادہ ہیں۔ انھوں نے اخلاقی مفاسد، روحانی زوال، عریانیت وفحاشیت، مسلمانوں کی دوں ہمتی، مستشرقین کی تعصب کیشی، فرقہ پرستی اور تنگ نظری، دورِ جدید کی جاہلیت، تہذیبی انحطاط وغیرہ موضوعات پر بغیر خوفِ لومۃ لائم لکھا ہے۔ ان اجتماعی مفاسد پر لکھتے ہوئے ان کی تحریروں میں جوش، روانی اور حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ صرف ایک نمونہ ملاحظہ کریں:

وہ یہ بلائے عظیم ہے، جس کی تباہ کاریاں دیکھ دیکھ کر خود مغربی ممالک کے صاحبِ فکر لوگ چیخ اٹھے ہیں اور وہاں مختلف سمتوں سے یہ آواز بلند ہو رہی ہے کہ مالیات کی اتنی بڑی طاقت کا ایک چھوٹے سے غیر ذمہ دار خود غرض طبقے کے ہاتھ میں مرتکز ہو جانا پوری اجتماعی زندگی کے لیے سخت مہلک ہے۔ مگر ہمارے ہاں ابھی تک یہ تقریریں ہوئے جارہی ہیں کہ سود خواری تو پرانے گدی نشین مہاجن کی حرام ونجس تھی آج کا کرسی نشین و موٹر نشین بینکر بے چارہ تو بڑا ہی پاکیزہ کاروبار کر رہا ہے، اس کے کاروبار میں روپیہ دینا اور اس سے اپنا حصہ لے لینا آخر کیوں حرام ہے؟ حالاں کہ فی الحقیقت اگر پرانے مہاجنوں اور آج کے بینکروں میں کوئی فرق واقع ہوا ہے تو وہ اس کے سوا

---

(۱) تفہیم القرآن، جلد اول، دیباچہ، ص ۷۔

> کچھ نہیں کہ پہلے یہ لوگ اکیلے ڈاکا مارتے تھے، اب انھوں نے جتھ بندی کر کے ڈاکوؤں کے بڑے بڑے گروہ بنا لیے ہیں۔ اور دوسرا فرق، جو شاید پہلے فرق سے بھی زیادہ بڑا ہے، یہ ہے کہ پہلے ان میں کا ہر ڈاکو نقب زنی کے آلات اور مردم کشی کے ہتھیار سب کچھ اپنے ہی پاس سے لاتا تھا، مگر اب سارے ملک کی آبادی اپنی حماقت اور قانون کی غفلت و جہالت کی وجہ سے بے شمار آلات اور اسلحہ فراہم کر کے 'کرائے' پر ان منظم ڈاکوؤں کے حوالے کر دیتی ہے۔ روشنی میں یہ اس کو 'کرایہ' ادا کرتے ہیں اور اندھیرے میں اسی آبادی پر اسی کے فراہم کیے ہوئے آلات و اسلحہ سے ڈاکا ڈالتے ہیں۔(۱)

مولانا مودودی کے معترضین کی یہ شکایت رہی ہے کہ وہ مغربی تہذیب کو محدّب شیشے سے دیکھتے رہے۔ یہ شکایت بہ جاے خود کوتاہ بینی اور کم اندیشی پر مبنی ہے۔ ساتھ ہی، یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ ان کا منصب مغربی تہذیب کی یلغار کے خلاف صرف دفاع کرنا ہی نہ تھا بلکہ تبلیغ دین کے ساتھ احیاے ملت کا متوازن فریضہ بھی وہ ایک ساتھ ادا کر رہے تھے۔ وہ اسلام کو ایک مکمل نظامِ حیات اور مسلم کلچر کو اعلیٰ اقدار کا بہترین مظہر بنا کر پیش کر رہے تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں ان کا رول ایک مصلحِ ملت اور مجدد کا تھا۔ وہ خود کو ملتِ اسلامیہ کا ایک ذمہ دار فرد تصور کرتے تھے، جو اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ پوری ملت کے لیے میدانِ کارزار میں اترا تھا۔ اس محاذ پر مخالفین سے لڑتے ہوئے ان کے طنز میں نشتریت، شدت اور کہیں کہیں زہرناکی کا آنا ایک فطری امر تھا۔

مولانا مودودی کی حق گوئی و حق پسندی اور حرف حق کی علم برداری نے ان کے متعدد دشمن اور معاند پیدا کر دیے تھے۔ لیکن مخالفین و معاندین کا پوراز ور حق آشنا قلم پر قدغن لگانے سے قاصر ہی رہا۔ مولانا موصوف تادمِ آخر حق نویسی کا یہ مقدس فریضہ انجام دیتے رہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا پوری دیانت داری اور جرأت مندی سے لکھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر تصنیف کو ان کے مخالف و ہمدرد پڑھے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اگر وہ مسلمانوں میں دینی و سیاسی بیداری لانے کے لیے مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش اور مسئلہ قومیت لکھتے ہیں تو خود مسلمانوں کے طعن و تشنیع کے شکار ہوتے ہیں۔ اگر وہ مسئلہ قادیانیت لکھ کر ایک بڑے فتنے کا انسداد کرتے ہیں تو حکومت کے ذریعے معتوب ہوتے ہیں۔ خلافت و ملوکیت اور تجدید و احیاے دین لکھتے ہیں تو علماے کرام

---

(۱) سود، ص ۱۰۵-۱۰۶۔

کی طرف سے صدائے احتجاج بلند ہوتی ہے۔ اگر ایک طرف انھوں نے مغرب کے اخلاقی مفاسد اور مراضِ خبیثہ پر کاری ضرب لگائی ہے تو دوسری طرف وہ مغرب کے علمی اور سائنسی ترقیات کے معترف بھی ہیں۔ انھیں مغرب کا یک رُخا نقاد کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا مودودی کی نگارشات کا محور و مرکز چوں کہ دینیات ہی رہا ہے، اس لیے اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ عربی و فارسی کے الفاظ و تراکیب، آیاتِ ربانی اور احادیثِ رسول ﷺ کا بھی استعمال کر کے مسئلہ زیرِ بحث کو سند و دلیل کے ساتھ پیش کرتے۔ حالاں کہ ایسی عبارتیں ان کے یہاں کم ہی ہیں جن میں انھوں نے عربی و فارسی کے ادق الفاظ، قرآنی آیات یا اقوالِ رسولؐ و صحابہؓ کا استعمال کیا ہو۔ صرف ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

> ایک حقیقی مسلمان کی حیثیت سے جب میں دنیا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر اظہارِ مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ترکی پر ترک، ایران پر ایرانی اور افغانستان پر افغان حکمراں ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں حکم الناس علی الناس کے نظریے کا قائل نہیں ہوں کہ مجھے اس پر مسرت ہو۔ میں اس کے برعکس حکم اللہ علی الناس بالحق کا نظریہ رکھتا ہوں، اور اس اعتبار سے میرے نزدیک انگلستان پر انگریزوں کی حاکمیت اور فرانس پر اہلِ فرانس کی حاکمیت جس قدر غلط ہے، اسی قدر ترکی اور دوسری ملکوں پر ان کے اپنے باشندوں کی حاکمیت بھی غلط ہے، بلکہ اس سے زیادہ غلط، اس لیے کہ جو قومیں اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں ان کا خدا کی حاکمیت کے بجائے انسانوں کی حاکمیت اختیار کرنا اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے۔ غیر مسلم اگر ضآلّین کے حکم میں ہیں تو یہ اس طرزِ عمل کی بنا پر مغضوب علیھم کی تعریف میں آجاتے ہیں۔(۱)

مولانا مودودی کے اسلوب کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں ایسی چیزوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے، کیوں کہ اسلوب کے تجزیے میں ان عناصر پر نظر جانی چاہیے جو ادیب کی تحریروں میں غالب ہوں، ورنہ ہر مصنف کے یہاں عموماً ہر قسم کے نمونے تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ غالب عناصر ہی ادیب کے اسلوب میں امتیازی شان پیدا کرتے ہیں۔ مولوی نذیر احمد، علامہ شبلی اور مولانا آزاد کے اسلوب کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلے اس پر نگاہ جاتی ہے کہ انھوں نے عربی و

---

(۱) تحریک آزادی ہند اور مسلمان، دوم، ص ۱۰۱، ۱۰۲۔

فارسی الفاظ اور قرآن وحدیث کے ٹکڑے بہ کثرت استعمال کیے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی عبارتوں میں گرانی اور ثقالت پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن مولانا مودودی کی تحریروں میں اس کے برعکس دہلی کی ٹکسالی زبان، سادہ وشیریں الفاظ، دل نشیں لہجہ اور قوتِ تاثیر پائی جاتی ہے۔

اردو کے نثری اسلوب میں مترادفات کا بہ کثرت استعمال ملتا ہے۔ مترادف الفاظ کے استعمال سے نہ صرف عبارت کے حسن وجمال میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ زورِ بیان اور معنی کلام میں وسعت وتاثیر بھی پیدا ہوتی ہے۔ بالخصوص خطیبانہ اسلوب کے لیے اس کا استعمال بڑا کارگر ثابت ہوا ہے۔ ادیب جب کسی خاص جذبے اور احساس یا موضوع کی وسعت ومعنویت کو ظاہر کرنا چاہتا ہے تو وہ ایک ہی معنی کے لیے کئی موزوں الفاظ استعمال کرتا ہے، جو ادیب کے مطلب ومدعا کو واضح کرنے میں ممد ومعاون ہوتے ہیں۔ لیکن ہم معنی الفاظ کے استعمال میں ادیب کو افراط و تفریط سے پرہیز کرنا چاہیے، کیوں کہ اس میں بے اعتدالی آجانے سے تصنع اور بناوٹ پیدا ہوجاتی ہے۔ مولانا موصوف نے بھی ان مترادفات کا استعمال اظہار وبیان میں زور واثر اور گہرائی وگیرائی پیدا کرنے کے لیے کیا ہے اور اس ضمن میں انھوں نے حد درجہ احتیاط اور اعتدال سے کام لیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

> ان متحارب اور متشدّد گروہوں کے درمیان مسلمانوں کا سوادِ اعظم اپنے خیالات میں انھی نظریات اور اصولوں پر قائم تھا، جو خلفاے راشدین کے زمانے سے مسلّم چلے آرہے تھے۔(۱)

> جی ہاں! یہ وہی 'نقاب' (Veil) ہے، جس کو یورپ انتہادرجے کی مکروہ اور گھناؤنی چیز سمجھتا ہے، جس کا محض تصور ہی فرنگی ضمیر پر ایک بارِ گراں ہے، جس کو ظلم اور تنگ خیالی اور وحشت کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔ ہاں، یہ وہی چیز ہے جس کا نام کسی مشرقی قوم کی جہالت اور تمدنی پس ماندگی کے ذکر میں سب سے پہلے لیا جاتا ہے۔ اور جب یہ بیان کرنا ہوتا ہے کہ کوئی مشرقی قوم تمدن وتہذیب میں ترقی کر رہی ہے تو سب سے پہلے جس بات کا ذکر بڑے انشراح اور انبساط کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ اس قوم سے نقاب رخصت ہوگئی ہے۔(۲)

---

(۱) خلافت وملوکیت، ص ۲۲۰۔

(۲) پردہ، ص ۲۷۲۔

مولانا مودودی نے اپنی تحریروں میں جملوں کو طنز آمیز بنانے اور معنی خیز پیراہن دینے کے لیے انگریزی الفاظ کا خوب صورت اور برمحل استعمال کیا ہے۔ مثلاً کیریکٹر، ڈسپلن، ڈکٹیٹرشپ، نیشنلزم، امپیریلزم، لیڈرشپ، مینی فیسٹو، ڈیموکریسی، کلچر، آرٹ، ڈیوٹی، پوزیشن، ووٹر، ٹیکس، ریفارمر وغیرہ۔ یہ طرزِ تحریر جہاں ایک طرف مولانا الطاف حسین حالی کی یاد دلاتا ہے وہیں دوسری طرف اس میں اکبر الٰہ آبادی کے اسلوب کا اثر بھی محسوس ہوتا ہے۔ مولانا حالی نے تو پیرویِ مغرب اور انگریز کی بالادستی کے زیرِ اثر اس کا استعمال کیا تھا، مگر اکبر الٰہ آبادی نے اس تکنیک کو طنزیہ اسلوب کے طور پر اختیار کیا تھا۔ یہ بات واضح رہے کہ مولانا مودودی پیرویِ مغرب کے سخت مخالف اور معاند تھے، البتہ وہ جب کبھی مغربی طرزِ فکر اور 'نئی روشن خیالی' پر طنز کرتے تھے تو یہ انگریزی الفاظ نشتر کا کام دیتے تھے۔

بہ ہر حال، مولانا مودودی کے اسلوب میں اس قسم کی مثالیں تلاشِ بسیار کے بعد ہی ملتی ہیں۔ دراصل مولانا کے اسلوب کی امتیازی خصوصیت نہ ہندی کے غیر مانوس الفاظ کا استعمال ہے اور نہ انگریزی الفاظ کا استعمال بلکہ وہ اندازِ تحریر ہے جو دہلی کی ٹکسالی زبان، محاوروں اور روزمروں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ محاوروں کے برجستہ اور بے تکلف استعمال اور روزمرہ کی چاشنی نے ان کی تحریروں میں روانی و برجستگی اور لطف و حلاوت کے عناصر پیدا کردیے ہیں۔ محاوروں کے استعمال میں انھوں نے اعتدال اور توازن ملحوظ رکھا ہے۔ ان کے محاورے نہ صرف عبارت کی پیداوار ہوتے ہیں بلکہ یہ عبارتوں میں ربط و نظم بھی پیدا کرتے ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ انھوں نے محاورہ آرائی اور محاورہ بندی نہیں کی ہے کہ اس سے عبارت میں تکلف اور تصنع پیدا ہوجاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں محاورے رگِ جان کی حیثیت رکھتے ہیں کہ اگر اسے نکال دیجیے تو نہ صرف جملے کے ربط و نظم میں فساد ہوگا بلکہ تحریر بے جان اور خشک ہوجائے گی۔ چند نمونے درج کیے جاتے ہیں:

۱- مگر اس قوم کے نادان لوگ اور اس کے خود غرض قبائلی سردار اس راہ نما کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑجاتے ہیں اور اسے ناکام کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگادیتے ہیں۔(۱)

۲- آخر ۵۸۷ قبل مسیح میں (بابل کے بادشاہ) بخت نصر نے ایک سخت حملہ کرکے

(۱) سیرت سرورِ عالمؐ، اول، ص ۱۰۷۔

یہودیہ کے تمام بڑے چھوٹے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یروشلم اور ہیکلِ سلیمانی کو اس طرح پیوند خاک کیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ کھڑی نہ رہی۔ یہودیوں کی بڑی تعداد کو ان کے علاقے سے نکال کر ملک ملک میں تتر بتر کردیا۔(۱)

۳- ان کی شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ جب غالب ہوں تو مغلوب کے قصور معاف کردیں، جب قادر ہوں تو بدلہ لینے سے درگزر کریں، اور جب کسی زبردست یا کم زور آدمی سے کوئی خطا سرزد ہوجائے تو اس سے چشم پوشی کرجائیں، لیکن جب کوئی طاقت ور اور اپنی طاقت کے زعم میں ان پر دست درازی کرے تو ڈٹ کر کھڑے ہوجائیں اور اس کے دانت کھٹے کردیں...... اس قسم کے لوگوں کے لیے وہ لوہے کا چنا ہوتا ہے۔ جسے چبانے کی کوشش کرنے والا اپنا ہی جبڑا توڑ لیتا ہے۔(۲)

اردو کے نثری سرمایے میں اشعار کا وافر استعمال ملتا ہے۔ نثر نگاروں کی یہ روش دراصل نثر اور شعر میں آہنگ اور عبارت کو رنگین، دل کش اور پرتاثیر بنانے کی ایک کوشش ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد، علامہ شبلی نعمانی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اس ضمن میں مثالیں قائم کی ہیں۔ اشعار کے استعمال میں تو مولانا ابوالکلام آزاد کو مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ایک طرف ان کی نثر اردو کے نثری ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے وہیں اشعار کے بہ کثرت استعمال سے ان کی نثر پر شعر غالب ہوتا نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس مولانا مودودی نے اپنی نثری تخلیقات میں اشعار کا استعمال شاذ و نادر ہی کیا ہے، لیکن جہاں کہیں اشعار استعمال ہوئے ہیں وہ موقع و محل کے اعتبار سے نہایت چست اور برجستہ معلوم ہوتے ہیں۔ کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ انھوں نے کم سنی میں شاعری بھی کی ہے اور شعر فہمی کا ذوق انھیں فطرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا۔ بہ قول جوش ملیح آبادی، وہ ظریف الطبع اور بہت اچھے سخن فہم تھے، مگر بنیادی طور پر وہ نثری مزاج رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں شعر اور نثر کے درمیان کش مکش کی صورت حال کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ مثال کے لیے صرف ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

ان کی خواہش ہے کہ جس خیالی جنت میں وہ جی رہے ہیں، جن سرابوں سے وہ چشمۂ آبِ حیواں پانے کی امیدیں باندھے بیٹھے ہیں اور جن غلط فہمیوں کا دل فریب طلسم

---

(۱) سیرت سرور عالمؐ، اول، ص ۶۲۴۔

(۲) تفہیم القرآن، چہارم، ص ۵۱۱۔

انھوں نے اپنے گرد بنا رکھا ہے، ان سب چیزوں کو جوں کا توں رہنے دوں۔ بلکہ اگر ہو سکے تو خود بھی ان لوگوں میں شامل ہو جاؤں جن کے لیے ان چیزوں کا سراہنا دین اور امت کی سب سے بڑی خدمت بنا ہوا ہے۔ اس خدمت کے فوائد بھی مجھے معلوم ہیں مگر میں مجبور ہوں کہ مجھے محبوب دشمن کے بہ جائے مبغوض دوست بننا زیادہ مرغوب ہے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی[۱]

صاحبِ طرز انشا پرداز کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ بعض اوقات وہ لفظوں کی تکرار سے اسلوب میں روانی اور ترنم پیدا کر لیتا ہے۔ اسلوبِ تحریر کی یہ وہ خوبی ہے کہ جس میں انشا پرداز کے ارادے اور کاوش کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ ایسے الفاظ خود بہ خود نوکِ قلم پر آ جاتے ہیں۔ مولانا مودودی انشا پرداز تھے۔ ان کی تحریروں میں تکرارِ الفاظ کی مثالیں ملتی ہیں۔ ان کے یہاں اسم، فعل اور صفت کی تکرار سے جملوں میں فصاحت و بلاغت اور بے ساختگی کے عناصر جمع ہو گئے ہیں۔ دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

''سب قوموں میں سے آدمی ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے جھنڈے کے نیچے آنے لگتے ہیں...... بڑے بڑے پہاڑ اس کے سامنے آتے ہیں اور نمک کی طرح پگھل پگھل اس آبِ رواں میں جذب ہو جاتے ہیں۔[۲]''

''وہ اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر چلنا اور ٹھوکریں کھا کھا کر گرنا ہی پسند کرتے ہیں۔[۳]''

بیش تر انشا پردازوں کی تحریروں میں ہر قسم کی طرزِ تحریر کے نمونے تلاش کیے جا سکتے ہیں، مگر کچھ لوگوں کے طرز و انداز ایسے ہوتے ہیں، جو ان کے لیے شناختی کارڈ بن جاتے ہیں۔ یہی وہ انفرادیت ہے، جس سے کسی ادیب کے اسلوب اور اس کی شخصیت کی پہچان ہوتی ہے۔ اسلوب میں شخصیت کے اسی اظہار کو خونِ دل اور خونِ جگر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مولانا کی نگارشات کے پیشِ نظر، یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں موقع محل کے لحاظ سے اظہار و بیان کے تمام طریقے استعمال کیے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کے یہاں خطابیہ لہجہ کسی

---

(۱) تحریک آزادیِ ہند اور مسلمان، دوم، ص ۷۱۔

(۲) مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش، سوم، ص ۹۱۔

(۳) تفہیم القرآن، اول، ص ۵۷۸۔

قدر نمایاں ہے۔ یہ خطابیہ لہجہ علامہ شبلی اور مولانا آزاد کی تحریروں میں بہ کثرت ملتا ہے، مگر مولانا آزاد کا خطابیہ اسلوب، تحریر کو تقریر بنا دیتا ہے، جب کہ مولانا مودودی کا خطابیہ اسلوب قاری کو مخاطب کا درجہ عطا کر دیتا ہے اور پڑھنے والا ایک احساسِ رفاقت محسوس کرتا ہے۔(۱)

مولانا مودودی کے یہاں یہ خطابیہ اسلوب استفہامیہ لہجے میں سامنے آتا ہے۔ یہ وہ مخصوص طرزِ تخاطب ہے، جس کے ذریعے مولانا، قاری کی ساری توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں۔ ذیل میں چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ ''بتایے! اگر کوئی شخص بیمار ہو اور علم طب کی کوئی کتاب لے کر پڑھنے بیٹھ جائے اور یہ خیال کرے کہ محض اس کتاب کو پڑھ لینے سے بیماری دور ہو جائے گی تو آپ اسے کیا کہیں گے؟(۲) ''

۲۔ ''مگر نظامِ کائنات پر گہری نگاہ ڈال کر دیکھیے، کیا اس نظام میں انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح رونما ہو سکتے ہیں(۳)؟''

۳۔ ''اچھا! اگر یہ سچ ہے تو مجھے بتایے کہ یہ زبردست انتظام، یہ حیرت انگیز باقاعدگی، یہ کمال درجے کی ہمواری، یہ زمین و آسمان کی بے حد و حساب چیزوں اور طاقتوں میں کامل موافقت آخر کس وجہ سے ہے(۴)''

مولانا مودودی کے طرزِ تخاطب کا بہ غور جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ مخاطب کو مرعوب کرنا نہیں چاہتے اور اور نہ وہ انھیں کم تر اور ابتر تصور کرتے ہیں، اس لیے ان کی تحریروں میں 'تم' کی تکرار نہیں ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی تحریروں کا مقصد محض ترسیل و ابلاغ کی حد تک نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد ہم نوا، ہم خیال اور رفیقِ کار بنانا تھا، اس لیے انھوں نے اپنی بیش تر تحریروں میں قاری کو 'آپ' سے مخاطب کیا ہے۔

مولانا مودودی کو اردو، فارسی اور عربی پر کامل دسترس حاصل تھی اور اس کے ساتھ ہی انھیں انگریزی زبان و ادب سے بھی گہرا لگاؤ تھا، لیکن انھوں نے اپنی نگارشات کے لیے برِ عظیم کی

(۱) ادبیاتِ مودودی، ص۱۷۹۔

(۲) خطبات، ص۴۷۔

(۳) اسلامی نظامِ زندگی اور اس کے بنیادی تصورات، ص۵۶۔

(۴) ایضاً، ص۷۲۔

مقبول ترین زبان اردو کو منتخب کیا۔ ان کی تحریروں میں عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کے علاوہ انگریزی الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ ان کے صحافتی ادب میں انگریزی الفاظ کی تعداد زیادہ ہے۔ مگر یہ الفاظ مشکل اردو اور فارسی الفاظ و اصطلاحات کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ انھوں نے اردو اور فارسی کے سب مشکل الفاظ و اصطلاح کے لیے قوسین میں انگریزی الفاظ پیش کر کے قاری کے لیے مفہوم و مدعا سمجھنا آسان کر دیا ہے۔ صرف دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱- ''یہ اس قسم کی پارٹی ہے، جو ایک مستقل نظام تہذیب و تمدن (Civilisation) بنانے کے لیے اٹھتی ہے اور چھوٹی چھوٹی قومیتوں کی تنگ سرحدوں کو توڑ کر عقلی بنیادوں پر ایک بڑی جہانی قومیت (World nationality) بنانا چاہتی ہے...... بلکہ اپنے نظریۂ حیات اور فلسفۂ اجتماعی (Social philosophy) کے مطابق خود اپنی تہذیب و مدنیت کی عمارت الگ بناتی ہے...... اگر جماعتی حیثیت کو اس سے الگ کر لیا جائے اور یہ مجرد ایک قوم بن کر رہ جائے تو یہ اس کا تنزل (Degeneration) ہے۔(۱)''

۲- ''تغیر جو کچھ بھی ہوگا، ان فطری اصولوں میں نہیں بلکہ بدلنے والے حالات پر ان کے انطباق (Application) میں ہوگا...... اور یہ اجتہاد ہی وہ چیز ہے جو نظامِ اسلامی کو ایک محرک و متحرک (Dynamic) نظام بناتا ہے، اور اس کے قوانین کو حالات و ضروریات کے مطابق مرتب (Adjust) کرتا رہتا ہے۔(۲)''

انگریزی الفاظ و اصطلاحات کے ذریعے معنی و مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

مولانا مودودی نے بعض مقامات پر عربی و فارسی الفاظ سے خوب صورت اور معنی خیز مشترکات اور ترکیبات بنائی ہیں، جو ان کی ذہانت و فطانت اور زبان و قواعد پر کامل دسترس کی دلیل پیش کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر کعبۂ مرادات، قریب المآخذ، قبلۂ حاجات، بطلِ جلیل، اقرب الی الصواب، موحدین کا بت خانہ، کمیونسٹ مہاجن، اینگلو محمڈن مسلمان، یرقانِ ابیض، اجتماعی ضمیر وغیرہ اسی طرح انھوں نے بعض پیرایوں میں نادر تنقیدی تمثیلیں بھی استعمال کی ہیں، جن کی تیزی و تندی فریق مخالف کے لیے زہر ہلاہل سے کم نہیں ہے، مثلاً: شیطانی زنبیل، بہیمی خواہشات کا دیو، تار عنکبوت، غرقِ مے ناب، طاعون کے چوہے، تپِ محرقہ، اخلاقی جذامی،

---

(۱) مسئلہ قومیت، ص ۱۹۰-۱۹۱۔

(۲) مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش، سوم، ص ۱۸۔

جمہوریت کا اِلٰہ، اخلاقی مساوات کا صور، فراخ دل عدالتیں، بدیہی البطلان، عظیم الشان مصیبت، احمقانہ لذت طلبی، شیطانی لشکرلٹریچر وغیرہ۔ ان مشترکات وترکیبات سے عبارت کی ترتیب وتہذیب اور دل کشی ودل پذیری میں اضافہ تو ہوتا ہے مگر یہ عام قسم کے قاری کے لیے غیر دل چسپ اور ناقابل فہم ہیں۔ مولانا موصوف کی تحریروں میں اس قسم کی مثالیں بہت کم ہی ملیں گی۔ بات دراصل یہ ہے کہ مولانا مودودی کے مخاطب ہر درجے کے قاری تھے۔ اس لیے ان کا اسلوب مخاطب کے فہم وشعور کے مطابق ادلتا بدلتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب میں تنوّع، رنگارنگی اور ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔

معاصرادیبوں سے تقابل

مولانا مودودی کے طرزِ تحریر اور اسلوبی امتیازات کا صحیح اندازہ کرنے اور کسی تنقیدی فیصلے تک پہنچنے کے لیے ان کی نثر نگاری کا تقابلی موازنہ ان کے معاصر نثر نگاروں سے کرنا ناگزیر ہے۔ لٰہذا، اس کے لیے ان کے معاصرین میں سے ہم نے خواجہ حسن نظامی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کا انتخاب کیا ہے۔ یوں تو ان کے معاصرین میں بڑے بڑے علمائے کرام اور مصنّفین تھے تاہم، جن لوگوں نے اردو زبان وادب کو اپنے افکارونظریات کی تبلیغ واشاعت اور اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا اور اردو کے اسالیبِ بیان میں اضافہ کرتے ہوئے اپنی منفرد شناخت بنائی ان میں یہ چاروں صاحبانِ اسلوب نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر ایک سنگِ میل کہے جاسکتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ان کی تحریروں کا مشترک وصف یہ ہے کہ ان کا دائرۂ کار علم وادب اور دین وسیاست ہی ہے، اس لیے ان ادیبوں کا انتخاب میری نظر میں موزوں ومناسب ہے۔ تقابلی مطالعے میں پہلے ان کی نثری خدمات اور اسلوبِ بیان کا مختصر جائزہ لیا جائے گا، پھر مولانا مودودی کے طرز سے تقابل کرتے ہوئے کسی تنقیدی رائے تک پہنچنے کی کوشش کی جائے گی۔

خواجہ حسن نظامی (۱۸۷۸-۱۹۵۵) ایک پیر طریقت، صوفی منش بزرگ اور صاحبِ طرز نثر نگار تھے۔ انھوں نے سیاسی، سماجی، اخلاقی اور مذہبی موضوعات پر کم وبیش پانچ سو کتابیں لکھیں، جن میں بہادر شاہ کا مقدمہ، دہلی کی آخری شمع، سی پارۂ دل، بیوی کی تعلیم، یزید نامہ،

میلادنامہ، کانا باتی اور کشن بیتی وغیرہ کو قبولِ عام کی سند حاصل ہے۔ خواجہ صاحب چوں کہ ایک صوفی تھے اور دردمند دل رکھتے تھے، اس لیے ان کی تحریروں میں صوفیانہ رنگ واضح ہے۔ ان کے بیش تر مضامین میں دردوغم کے جذبات اور سوز و گداز کی کیفیات پائی جاتی ہیں۔ سوز و گداز کی اس بڑھی ہوئی شدت نے کہیں کہیں طنز و نشتریت کا روپ اختیار کرلیا ہے۔ ان کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ ان کا لہجہ آسان اور عام فہم ہے۔ انھوں نے ٹھیٹھ ہندی کے الفاظ اور عربی و فارسی کے مشکل الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ ان کے یہاں تخیل آرائی کی جگہ حقیقت پسندی کا رجحان غالب ہے۔ تحریریں، عام طور سے سنجیدہ اور متین اور حد درجہ سادہ اور سلیس ہیں۔ بعض دفعہ یہ سادگی سہل ممتنع تک پہنچ جاتی ہے۔ سادگی، بے تکلفی اور برجستگی کے علاوہ جو تھوڑی بہت رنگینی اور دل کشی ان کے یہاں پائی جاتی ہے، کہا جاسکتا ہے کہ یہ مولانا محمد حسین آزاد کے مخصوص طرزِ تحریر کا اثر ہے۔ انھوں نے طول طویل فقروں کے بہ جائے اکثر چھوٹے چھوٹے جملے، مترادفات اور تکرار الفاظ کے ذریعے صوتی آہنگ کی فضا بنانے میں بھی کام یابی حاصل کی ہے۔

خواجہ حسن نظامی، دہلی کی ٹکسالی زبان کے ماہر انشا پرداز اور صوفی منش بزرگ تھے، ان کے صاحبِ طرز ہونے میں کوئی شک نہیں، لیکن زبان کی چاشنی، تخیل کی ریزہ خیالی، صوفیانہ جذب و مستی اور کچھ اصلاحی خیالات کے علاوہ خواجہ صاحب کا مطمح نظر کوئی انقلاب لانا نہیں تھا، اس وجہ سے وہ اپنے محدود دائرے میں بے شک کام یاب ہیں لیکن ان کی تحریر میں وہ بلند آہنگی، زمانے کی کایا پلٹ کردینے کا حوصلہ اور ذہنی و فکری سانچوں کو بدل دینے کا عزم نہیں ملتا۔ وہ دہلی کی محاوراتی زبان، خواتین کے احساسات اور مترادفات اور تکرار الفاظ کے ذریعے دل آویز صوتی آہنگ تو پیدا کرلیتے ہیں لیکن ان کا اسلوب اور طرزِ فکر ایک محدود دائرے سے آگے نہیں بڑھتا، البتہ خواجہ صاحب نے اپنے محدود دائرے میں جو گل بوٹے کھلائے ہیں اور سادگی میں جس پرکاری سے کام لیا ہے، وہ ان کی دل کش انشا پردازی پر دال ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد مختلف الحیثیات شخصیت تھے۔ وہ بیک وقت ایک عالمِ دین اور سیاست داں تھے۔ ادیب اور صحافی بھی اور حکیم و فلسفی بھی تھے۔ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کے علاوہ فرانسیسی زبان سے بھی اچھی طرح انھیں واقفیت تھی۔ ان کی نثری خدمات کا دائرہ بہت

وسیع ہے۔ انھوں نے مذہب و سیاست، فلسفہ وصحافت اور تعلیم و تاریخ وغیرہ موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی گراں قدر تخلیقات میں الہلال والبلاغ کے علمی و سنجیدہ مضامین، ترجمان القرآن کی حکیمانہ نکتہ طرازی، غبار خاطر کا انانیتی ادب و انشا اور خودنوشت سوانح تذکرہ نے دنیاے ادب میں شہرت ومقبولیت حاصل کی۔ اس ادبی سرمایے نے مولانا آزاد کی مخصوص فکر و نظر، علم و فضل اور طرزِ نگارش کو امتیازی حیثیت بخشی ہے۔

مولانا آزاد کی زبان و بیان میں رنگارنگی کے ساتھ اسلوبِ تحریر میں تنوّع اور ہمہ گیری بھی تھی، اس لیے ان کی تحریروں میں خلوصِ فکر ہے اور جوش و روانی بھی۔ اعلیٰ وارفع خیالات بھی اور فکر ونظر کی بلندی بھی۔ خطیبانہ اندازِ بیان بھی اور شاعرانہ حسن اور رنگینی بھی۔ دل پذیری بھی اور اثر آفرینی بھی۔ طنز کی نشتریت بھی اور سوز وگداز کی کیفیت بھی۔ شاید اسی لیے مولانا عبدالماجد دریابادی نے کہا ہے کہ ”مولانا آزاد تحریر وانشا میں اپنے اسلوب کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی“[1] اور بہ قول مولانا حسرت موہانی:

جب سے دیکھی ابو الکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں وہ مزہ نہ رہا

مولانا آزاد کے اسلوب اور طرز وروش کی اس انفرادیت کو خوبی سے تعبیر کیجیے یا کم زوری کا نام دیجیے کہ ان کے مخصوص طرزِ تحریر کی تقلید نہیں کی جاسکی۔

مولانا ابوالکلام آزاد اصلاً ایک قد آور علمی و ادبی اور سیاسی شخصیت کا نام ہے۔ ان کا بلند آہنگ طرزِ اظہار ہندستانی ادب و سیاست میں انمٹ نقش کا حامل ہے۔ سرسید کے بعد اپنے عصری ماحول کو مولانا آزاد نے بڑی گہرائی سے متاثر کیا، کیوں کہ ان کا مطمحِ نظر اور مقصدِ زندگی بھی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی طرح کش مکش اور انقلاب کا تھا۔ چناں چہ، ان کی علمی و عملی کاوشیں بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک دین وسیاست کو بین بین لے کر چلنے کا رہا۔ لیکن مولانا کی بڑھی ہوئی انفرادیت پسندی، انانیت شعاری اور حالات کے دباؤ کے سبب، انھیں اپنے مشن کو ادھورا چھوڑ کر شاید عصری سیاسی تقاضوں کے پیش نظر، اپنی نصف عمر حصول آزادی کی جدو جہد میں صرف کرنی پڑی اور انھوں نے اپنی جملہ صلاحیتیں بھی اسی کے لیے وقف کردیں۔ یہی وجہ ہے کہ

(۱) اردو کا ادیب عظیم، مولانا عبدالماجد دریابادی، ص ۲۵۔

تذکرہ، ترجمان القرآن، الہلال والبلاغ اور حزب اللہ کے مولانا ابوالکلام آزاد متحدہ قومیت اور جنگ آزادی کے سورما بن کر ابھرے۔ ان کی دینی اور احیائی تحریروں نے پوری اردو دنیا کو ایک زمانے تک خوب متحرک رکھا۔ اس کی حرکت وحرارت سے خود مولانا مودودی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ لیکن ان کی بعد کی تحریروں اور تصانیف میں وہ عالم گیر احیائی شعلہ جب وطنی حدود میں بجھ کر چنگاری بن گیا۔ مولانا آزاد کی تحریروں میں الفاظ کی سحر کاری، پہاڑی چشمے کا زوروشور اور اندازِ بیان کی صلابت، ایک زمانے تک مسلم رہی۔ اسی طرح تذکرہ، ترجمان القرآن اور الہلال والبلاغ کے بہت سے مضامین میں جو فلسفیانہ اور مفکرانہ انداز اختیار کیا گیا اس طرزِ اظہار کا بھی نقش مسلم ہے۔ یہی بلند آہنگی غبارِ خاطر میں شاعرانہ طرز اختیار کر لیتی ہے۔ غرض، ان کی پہلودار شخصیت اپنے اسالیبِ بیان کے اعتبار سے بھی رنگا رنگ اور مختلف النوع ہے، جس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا، مولانا آزاد کی انتہا پسندی اور ان کی شاعرانہ طبیعت انھیں مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے طرز اظہار کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے اس کو ثبات ودوام بخشنے سے محروم رہی۔ مولانا مودودی کی تعلیم وتربیت بھی مولانا آزاد کی طرح عام ماحول سے کٹ کر اپنے خانوادے ہی میں ہوئی، لیکن آگے چل کر ان کے مطالعے و مشاہدے نے انھیں احیائے دین کی طرف اس مستقل مزاجی کے ساتھ لگادیا کہ پھر وقت کے ہزار تھپیڑوں یہاں تک کہ دارورسن کی آزمایشوں، نے بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑا، بلکہ ان کی شخصیت اور ان کے طرزِ تحریر کو مزید جلا بخشی۔ مولانا آزاد اور مولانا مودودی کی خوش بختی یہ تھی کہ انھوں نے اپنے فکروفن کے سرمایے کو سمیٹ کر رکھا اور یکسوئی کے ساتھ اس کے بامعنی فروغ میں آخر وقت تک لگے رہے۔ اس لیے ایک نے اردو کو انانیتی ادب اور بلند آہنگ نثر سے نوازا تو دوسرے نے اردو نثر کو ایسی سلاست، پاکیزگی، پختگی اور سنجیدگی عطا کی، جس نے اردو نثر کی تاریخ میں اپنا منفرد اور ممتاز مقام بنالیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۸۹۲-۱۹۷۷) ایک عالم دین، صحافی، فلاسفر اور صاحبِ طرز انشاپرداز تھے۔ انھوں نے علم وادب، فلسفہ ونفسیات، ترجمہ وتفسیر قرآن، سیرت و شخصیت، صحافت، ڈراما، سفرنامہ، تحقیق وتنقید الغرض مختلف اصنافِ ادب میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی تخلیقات میں قرآن مجید کی تفسیر (اردو، انگریزی)، انشاے ماجد، حکیم الامت، نقوش و

تاثرات، سلطانِ ما محمدؐ، فلسفۂ جذبات وغیرہ کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ ان سب موضوعات پر لکھتے ہوئے انھوں نے نثر اردو کے مختلف اسالیب استعمال کیے ہیں۔ انھیں دہلی اور لکھنؤ کی زبان پر مکمل عبور تھا، مگر ان کی تحریریں دبستان لکھنؤ سے قریبی مناسبت رکھتی ہیں۔ انھیں محاوروں اور روزمرہ کے استعمال میں بہ خوبی ملکہ حاصل تھا۔ وہ عربی و فارسی کے دقیق الفاظ بھی بڑی روانی سے استعمال کرجاتے تھے اور عبارت کے تسلسل اور شگفتگی پر آنچ نہ آنے دیتے تھے۔ قدرتِ بیان اور قوتِ تاثیر ان کی تحریروں کی جان ہے مگر ان کے یہاں بعض اوقات بول چال اور متروک الفاظ کے بے محابا استعمال سے بدمزگی کی کیفیت بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ ان کی تحریروں میں سادگی، صفائی اور شفافیت تو ہے مگر فکر وخیال اور جذبہ واحساس میں مکمل ہم آہنگی نہیں پائی جاتی ہے۔ اسی بے احتیاطی اور بے اعتدالی ان کی نثر کو شخصی اور تاثراتی بنا دیا ہے۔

مولانا مودودی کے یہاں بھی موضوعات اور مضامین کی کثرت اور رنگارنگی مولانا عبدالماجد سے کم نہیں ہے، لیکن مولانا مودودی نے تمام تر رنگارنگی کے باوجود، اپنی مخصوص انفرادیت اور طرزِ اظہار کے امتیاز کو ہر جگہ برقرار رکھا۔ ایسا نہیں ہوا کہ وہ جس میدان میں گئے اس میدان کی وسعتوں میں کھو گئے یا وہاں اپنی مخصوص انفرادیت کو گم کردیا۔ مولانا عبدالماجد اپنی گراں قدر نثری خدمات کے باوجود، اسلوب اور طرزِ اظہار میں امتیاز پیدا نہیں کرسکے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی بیسویں صدی کے بڑے عالمِ دین، محقق، مصلح اور انشا پرداز تھے۔ ان کی مقبولیت وشہرت صرف ان کے وسعتِ مطالعہ، کثرتِ تصانیف اور عربی واردو زبان پر قدرت کی وجہ سے نہیں بلکہ ندوۃ العلما، دینی تعلیمی تحریک، مسلم پرسنل لا بورڈ، رابطۂ ادبِ اسلامی اور بہت سے علمی ودینی اداروں میں ان کے کلیدی کردار کی وجہ سے بھی ہے۔

مولانا علی میاں کی تصنیفات کا دائرہ وسیع ہے۔ انھوں نے حدیث وقرآنیات، تاریخ، علمِ کلام، سوانح وخاکہ اور اصلاحیات کے علاوہ خالص فکری موضوعات پر بھی اہم مضامین لکھے ہیں۔ ان کی تصنیفات میں سیرتِ سید احمد شہید، پرانے چراغ، تاریخ دعوت وعزیمت اور الدین النصیحہ کو عالمی شہرت حاصل ہے۔

مولانا علی میاں کی طبیعت میں سادگی، نرمی اور شرافت، رواداری، خوش خلقی اور وضع داری

نے ان کے اسلوبِ تحریر میں سنجیدگی ومتانت اور سوز و دردمندی کے عناصر بھر دیے ہیں۔ ان کی زبان پختہ اور سنجیدہ ہے۔ ان کے اسلوبِ نثر کی تعمیر و تہذیب میں مولانا مودودی کے فکر کی رخشندگی بھی ہے اور مولانا الیاس کی دردمندی بھی، علامہ اقبال کی ضربِ کلیمی بھی اور مولانا آزاد کا زورِ خطابت بھی ہے۔ مجموعی طور پر انھوں نے اپنی تحریروں میں بیسویں صدی کی نثر کی ترجمانی کی ہے۔

مولانا علی میاں تحریکِ مجاہدین کے خانوادے سے راست تعلق رکھتے تھے۔ چناں چہ، مولانا مودودی نے جب تحریکِ اسلامی کی داغ بیل ڈالی تو علی میاں کے مزاج کی انقلابیت نے انھیں تحریک سے وابستہ کر دیا اور ایک طرح سے عمر بھر مولانا علی میاں کی تصانیف کا رُخ احیاے دین ہی کی غرض سے جاری رہا، مگر علی میاں کی تحریروں پر تاریخ اور تصوف کا جو گہرا اثر تھا اور عربی زبان وادب پر ان کی گرفت نے ان کے اسلوبِ نثر میں بہت سی خوبیوں کے باوجود وہ کاٹ، منطقیت اور دلوں کی دنیا الٹ پلٹ کر دینے کی صلاحیت تا دیر برقرار نہیں رکھی۔ بالخصوص، ان کی زندگی کے آخری حصے پر تصوف وسلوک کا جو گہرا اثر ہوا، اس نے ان کی تحریروں میں سنجیدگی کے ساتھ خوب صورت دردمندی کی بھی آمیزش کر دی۔ مولانا مودودی کی طرح علی میاں بھی 'مشرق سے ہو بے زار نہ مغرب سے حذر کر' کے قائل تھے لیکن مزاج اور زاویۂ نظر کے فرق کی وجہ سے اسلامی دنیا میں مغربیت اور مشرقیت کی کش مکش اور مولانا مودودی کی تنقیحات کے فکر وفن کا اگر مطالعہ کریں تو مقصد کی ہم آہنگی کے باوجود دونوں میں طرزِ بیان کا فرق بالکل واضح ہو جائے گا۔

ان پانچوں اکابرینِ نثر کی جملہ تحریروں پر اگر ہم ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو ان میں کئی خوبیاں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اولاً: صحافت، دوم: اسلامیت، سوم: احیاے دین اور چہارم: اصلاحِ امت۔ لیکن اس کے باوجود، ان پانچوں نے فکر ونظر اور طرزِ بیان کے اعتبار سے جو طریقہ اختیار کیا، اس کی وجہ سے ان سب کا اپنا اپنا منفرد رنگ بھی نمایاں ہوا۔ چوں کہ قدرت کے کارخانے میں کوئی ایک چیز دوسری کے مماثل نہیں ہوتی، اس لیے ان پانچوں کے پانچ رنگ بھی نہ صرف فطری ہیں بلکہ جدید اردو نثر کی قوت بھی ہیں۔ ان سب کی اپنی اپنی جگہ پر ضرورت

اور افادیت واضح ہے۔ ہم تو اردو نثر کے طالب علم کی حیثیت سے جب اسالیبِ بیان کے اس تنوّع کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو مطالعے کی مجبوری کسی نتیجے پر پہنچنے اور ان کی درجہ بندی کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ممکن ہے، مختلف نکاتِ نظر کے اہلِ علم ہماری رائے سے اتفاق نہ کریں لیکن ہم نے مجموعی طور پر ان سب کے اسالیب کے تفصیلی اور تجزیاتی مطالعے سے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہی ہے کہ مولانا مودودی کی نثر زیادہ یکسو، مدلل، منطقی، دل و دماغ کو جھنجھوڑنے والی، کہیں ضربِ کلیمی اور کہیں مرہم اور پھائے رکھنے والی ہے۔ ایک مخصوص رخ اور سمت کی طرف اپنے قارئین کو لے جانے میں مولانا مودودیؒ بڑی کام یاب، دل کش اور منفرد طرزِ تحریر رکھتے ہیں۔

باب چہارم

مولانا مودودیؒ کا ادبی مقام

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے نثری کارناموں، ان کے اسلوب کی انفرادیت اور معاصرین کے اسلوب سے تقابلی مطالعے کے بعد، ایک اہم سوال یہ ہے کہ ان کا اردو کے نثری ادب میں کیا مقام ہے؟ ان کی شہرت اور مقبولیت کی وجہ کیا ہے؟ کیا ان کی بے پناہ شہرت میں ان کی صحافت، سوانح نگاری یا مکتوب نگاری کا حصہ ہے؟ کیا انھیں ترجمہ وتفسیرِ قرآن میں فقید المثال کارنامہ انجام دینے کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہوئی ہے؟ کیا مختلف دینی و سیاسی، سماجی و اصلاحی، معاشی وتاریخی اور تہذیبی وتمدنی موضوعات پر لکھے گئے توضیحی وتشریحی اور تنقیدی و تنقیحی مضامین نے انھیں امتیازی حیثیت دی ہے؟ اور کیا ان کی مقبولیت کا راز اس میں ہے کہ وہ بیک وقت عالمِ دین، دانش ور، سیاست داں، مدبّر و مفکر، فلسفی اور نفسیات داں اور اس کے ساتھ ساتھ تحریک اسلامی (جماعت اسلامی) کے بانی وقائد اور بلند و بالا علمی وروحانی شخصیت تھے؟ یا پھر یہ کہ ان سب میدانوں میں لکھتے ہوئے انھوں نے اردو کے نثری اسالیب کے پیش نظر، معیاری اور بہترین تخلیقی نثر پیش کی ہے؟ ذاتی عقیدت اور تاثراتی ذہن سے بالاتر خالص غیر متعصّبانہ نظر سے، مولانا مودودی کی علمی و ادبی اور دینی وتحریکی فتوحات اور ان کے قاموسی ذہن کا جائزہ لیں تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ان کی عالم گیر شہرت ومقبولیت کا راز ان تمام باتوں میں ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ بلا شبہہ، مولانا موصوف بیسویں صدی کی ایک بہت بڑی علمی و ادبی شخصیت تھے، جنھوں نے اپنی نگارشات سے نہ صرف اردو کے اسالیبِ بیان میں خوش گوار اضافے کیے بلکہ اپنی منفرد طرزِ نگارش کی وجہ سے اردو کے نثری ادب میں امتیازی مقام حاصل کیا ہے۔

مولانا مودودی کے ادبی مقام کی تعیین کے لیے ان کے اسلوب کی زمانی ترتیب، ان کی شخصیت اور اسلوب کی تعمیر میں کارفرما محرکات کو پیشِ نظر رکھنا، میں ضروری سمجھتا ہوں۔ ذیل میں مولانا مودودی کی ادبی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کرکے، پہلے ان کے اسلوب کا مطالعہ کیا جائے گا اور پھر ان کی شخصیت اور اسلوب کے تعمیری عناصر کا جائزہ لیا جائے گا، تاکہ ان کے ادبی مقام کے سلسلے میں کوئی تنقیدی رائے قائم کی جاسکے۔

تصنیف وتالیف کی راہ میں قدم رکھنے والے ہر قلم کار کے فکر وفن کو شعور کی منزل تک پہنچنے سے پہلے نشو ونما کے مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کچھ تو مشاہیر کے طرزِ اظہار کی تقلید کرتے ہیں اور اکثر گم کردہ راہ ہو جاتے ہیں۔ اور جن کی طبیعت میں جودت وندرت ہوتی ہے وہ اپنا مخصوص اور منفرد طرز پیدا کر لیتے ہیں اور صاحبِ طرز انشا پرداز کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ مولانا مودودی کے فکر وفن اور طرزِ تحریر کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ نشو ونما کا ہر مرحلہ بہ جائے خود ان کے لیے ایک منزل تھا۔ دوسرے لفظوں میں طرزِ تحریر کے ارتقا کے ہر دور میں ان کی تحریروں میں ایک خاص پختگی اور انفرادیت پائی جاتی تھی۔

مولانا مودودی کی ادبی زندگی کو تقویمی اعتبار سے تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور ۱۹۲۰ سے ۱۹۳۰ تک ہے، جس میں انھوں نے مختلف اخباروں اور رسالوں کی خود ادارت کی اور کئی اہم موضوعات پر مضامین لکھے۔ ۱۹۲۸ میں الجہاد فی الاسلام جیسی معرکہ آرا کتاب لکھی جو اپنے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے منفرد اور لافانی تصنیف ہے۔ دوسرا دور ۱۹۳۰ سے ۱۹۵۰ تک دو دہائیوں پر مشتمل ہے، جس میں انھوں نے علمی وتحریکی رسالے ترجمان القرآن کا اجرا کیا اور اس کی ادارت سنبھالی۔ اس میں شائع شدہ مضامین کے متعدد مجموعے کئی بار شائع ہو کر بے حد مقبول ہوئے۔ تیسرا اور آخری دور ۱۹۵۰ سے ۱۹۷۹ تک ۳۰ برسوں پر مشتمل ہے، جس میں انھوں نے خلافت وملوکیت اور سیرتِ سرورِ عالمؐ جیسی تاریخ وسیرت پر مستند اور معتبر کتب لکھی، اور ترجمہ وتفسیرِ قرآن کے باب میں تفہیم القرآن اور ترجمۂ قرآن مجید لکھ کر عظیم کارنامہ انجام دیا۔

پہلے دور کی تحریروں میں الجہاد فی الاسلام ایک بہترین نمونہ ہے، جو علمی اور معیاری

اردو نثر کی بہترین مثال پیش کرتا ہے۔ مولانا مودودی کی اس پہلی قابلِ قدر تصنیف میں زبان و بیان کی کوئی خامی، ناپختگی اور نارسائی نہیں ہے۔ اس میں طرزِ مودودی کی انفرادیت(۱) پوری طرح نمایاں ہوگئی ہے۔ الفاظ کی سادگی، بیان کی روانی، عبارت کی نظم و پابندی اور نکتہ سنجی اور معنی آفرینی نے مل کر ایک سحر انگیز فضا قائم کردی ہے۔ الجہاد فی الاسلام کا پہلا پیرا گراف ملاحظہ کیجیے جو نثر جدید کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے:

انسانی تمدّن کی بنیاد جس قانون پر قائم ہے، اس کی سب سے پہلی دفعہ یہ ہے کہ انسان کی جان اور اس کا خون محترم ہے۔ انسان کے تمدنی حقوق میں اولین حق زندہ رہنے کا حق ہے، اور اس کے تمدّنی فرائض میں اولین فرض زندہ رہنے دینے کا فرض ہے۔ دنیا کی جتنی شریعتیں اور مہذب قوانین ہیں، ان سب میں احترامِ نفس کا یہ اصول ضرور موجود ہے۔ جس قانون اور مذہب میں اسے تسلیم نہ کیا گیا ہو، وہ نہ تو مہذب انسانوں کا مذہب و قانون بن سکتا ہے، نہ اس کے ماتحت رہ کر کوئی انسانی جماعت پر امن زندگی بسر کرسکتی ہے، نہ اسے کوئی فروغ حاصل ہوسکتا ہے۔ ہر شخص کی عقل خود سمجھ سکتی ہے کہ اگر انسان کی جان کی کوئی قیمت نہ ہو، اس کا کوئی احترام نہ ہو، اس کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہ ہو تو چار آدمی کیسے مل کر رہ سکتے ہیں؟ ان میں کس طرح باہم کاروبار ہوسکتا ہے؟ انھیں وہ امن و اطمینان اور وہ بے خوفی و جمعیتِ خاطر کیوں کر حاصل ہوسکتی ہے جس کی انسان کو تجارت، صنعت اور زراعت کرنے، دولت کمانے، گھر بنانے، سیر و سفر کرنے اور متمدن زندگی بسر کرنے کے لیے ضرورت ہوتی ہے؟ پھر اگر ضروریات سے قطع نظر کرکے خالص انسانیت کی نظر سے دیکھا جائے تو اس لحاظ سے بھی کسی ذاتی فائدے کی خاطر یا کسی ذاتی عداوت کی خاطر، اپنے بھائی کو قتل کرنا

---

(۱) مطالعۂ اسلوب کے باب میں عرض کیا جاچکا ہے کہ مولانا مودودی ابتدائی دور میں مشاہیرِ ادب مثلاً: سرسید، حالی اور شبلی کے بعد سب سے زیادہ مولانا آزادؔ کے طرزِ بیان سے متاثر تھے۔ مگر بہ تدریج ان تمام مشاہیر کے امتزاجی رنگ میں مولانا مودودی کا اپنا منفرد، استدلالی، تحریکی اور جذبِ اندرون سے معمور رنگ اس طرح شامل ہوگیا کہ طرزِ مودودی اردو کی نثری تاریخ میں 'اردوے مبین' کے نام سے مشہور ہوا۔ چناں چہ الجہاد فی الاسلام کے ابتدائی ابواب پر جابجا ابوالکلامی نثر کی چھاپ ہم واضح طور پر محسوس کرسکتے ہیں، مگر اسی ضخیم تاریخی و تحقیقی تصنیف کے نصف آخری حصے میں مولانا مودودی آزاد کے نثری سحر سے آزاد ہوگئے اور ان کا مخصوص رنگ نمایاں ہوگیا۔ پھر تو وقت کے ساتھ ان کا اسلوب نکھرتا ہی گیا۔

بدترین قساوت اور انتہائی سنگ دلی ہے، جس کا ارتکاب کر کے انسان میں کوئی اخلاقی بلندی پیدا ہونا تو درکنار، اس کا درجۂ انسانیت پر قائم رہنا بھی محال ہے۔(۱)

الجہاد فی الاسلام کی تحریروں کا جائزہ لینے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی وحالی اور نذیر و آزاد سے لے کر مولانا مودودی تک آتے آتے اردو نثر کا دامن بہت وسیع ہو چکا تھا اور اس میں ہر طرح کے موضوع ومباحث کے اظہار کے لیے پوری پختگی اور بالیدگی آچکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب مولانا مودودی نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ایک ادق اور فلسفیانہ موضوع پر قلم اٹھایا تو ان کی تحریر سلاست ونفاست اور فصاحت و بلاغت کا آئینہ بن گئی۔ یہاں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ شبلی وحالی اور نذیر و آزاد نے اردو نثر کو جس منزل پر چھوڑا تھا، وہیں سے مولانا مودودی نے اپنے علمی وادبی سفر کی شروعات کی ہے۔

ادبی زندگی کے دوسرے دور میں مولانا مودودی کا ذہن جماعتِ اسلامی کی تشکیل و تنظیم، تجدید واحیاے دین اور فکری ونظری انقلاب کی ترتیب وتہذیب میں مصروف رہا۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کے لیے ارادہ وعمل کی پختگی، ذہن ودماغ کی بالیدگی اور اس کے ساتھ ہی اظہار وابلاغ میں قوت وتاثیر کی ضرورت تھی۔ قدرت نے انھیں قاموسی ذہن اور تحریر و انشا کا ملکہ عطا کیا تھا۔ اس کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے اپنے طرزِ تحریر کے زور واثر، حکیمانہ طرزِ استدلال اور محنتِ شاقہ سے یہ تمام معرکے سر کیے۔ دوسرے دور کے ادبی کمالات میں بالخصوص دینیات، خطبات، سود اور پردہ اپنے اسلوبِ بیان اور طرزِ استدلال کے اعتبار سے نمایندہ تصنیفات ہیں۔ ان میں سے پردہ جو مولانا کی ادبی اور تحقیقی کاوشوں کا عمدہ نمونہ ہے، اس سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے، جس میں مولانا نے ایک عام فطری قانون کو شگفتہ زبان دے دی ہے:

> مرد اور عورت ایک دوسرے کی طرف دائمی میلان رکھتے ہیں۔ ان کے اندر ایک دوسرے کی طرف جذب وانجذاب اور صنفی کشش کے غیر محدود اسباب فراہم کیے گئے ہیں۔ ان کے قلب میں صنفی محبت اور عشق کا ایک زبردست داعیہ رکھا گیا ہے۔ ان کے جسم کی ساخت اور اس کے تناسب اور اس کے رنگ وروپ، اور اس کے لمس، اور اس کے ایک ایک جزو میں صنفِ مقابل کے لیے کشش پیدا کر دی گئی ہے۔ ان کی آواز، رفتار، انداز وادا، ہر ایک چیز میں کھینچ لینے کی قوت بھر دی گئی ہے، اور گرد وپیش

---

(۱) الجہاد فی الاسلام، ص ۲۳۔

کی دنیا میں بے شمار ایسے اسباب پھیلا دیے گئے ہیں جو دونوں کے داعیاتِ صنفی کو حرکت میں لاتے اور انھیں ایک دوسرے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ہوا کی سرسراہٹ، پانی کی روانی، سبزے کا رنگ، پھولوں کی خوش بو، پرندوں کے چہچہے، فضا کی گھٹائیں، شبِ ماہ کی لطافتیں، غرض جمالِ فطرت کا کوئی مظہر اور حسنِ کائنات کا کوئی جلوہ ایسا نہیں ہے، جو بالواسطہ یا بلا واسطہ اس تحریک کا سبب نہ بنتا ہو۔(۱)

مولانا مودودی کے دوسرے دور کی طرزِ تحریر کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اسلوب میں روانی و برجستگی کے ساتھ شگفتگی اور شایستگی میں خوش گوار اضافہ ہوا ہے۔ یہ اضافہ ان کے اسلوب میں دل کشی، جاذبیت اور اثر پذیری کے عناصر پیدا کر دیتا ہے۔

مولانا مودودی کی ادبی نگارشات کا تیسرا اور آخری دور ان کے طرزِ نگارش کے عروج کا دور ہے۔ یہ دور پچھلے ادوار سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ البتہ یہاں ان کا اسلوبِ تحریر مزید پختہ اور محکم نظر آتا ہے۔ اس دور کے دو عظیم کارنامے خلافت و ملوکیت اور ترجمہ و تفسیر قرآن (تفہیم القرآن) ہیں۔ تفہیم القرآن مولانا کے اسلوبِ تحریر کا نمونۂ کمال ہے۔ اس میں اسلوبِ تحریر کی تمام اعلیٰ صفات جمع ہوگئی ہیں۔ تفہیم القرآن کے دیباچے سے صرف ایک اقتباس دیکھیے، جس میں مولانا کے طرزِ تحریر کی بہت سی خوبیاں نمایاں ہوگئی ہیں:

پہلی چیز، جو ایک لفظی ترجمے کو پڑھتے وقت محسوس ہوتی ہے، وہ روانیِ عبارت، زورِ بیان، بلاغتِ زبان اور تاثیرِ کلام کا فقدان ہے۔ قرآن کی سطروں کے نیچے آدمی کو ایک ایسی بے جان عبارت ملتی ہے جسے پڑھ کر نہ اس کی روح وجد میں آتی ہے، نہ اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، نہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں، نہ اس کے جذبات میں کوئی طوفان برپا ہوتا ہے، نہ اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز عقل و فکر کو تسخیر کرتی ہوئی قلب و جگر تک اترتی چلی جا رہی ہے۔ اس طرح کا کوئی تاثر رونما ہونا تو درکنار، ترجمے کو پڑھتے وقت تو بسا اوقات آدمی یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ کیا واقعی وہ یہی کتاب ہے جس کی نظیر لانے کے لیے دنیا بھر کو چیلنج دیا گیا تھا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظی ترجمے کی چھلنی صرف دوا کے خشک اجزا ہی کو اپنے اندر سے گزرنے دیتی ہے۔ رہی ادب کی وہ تیز و تند اسپرٹ جو قرآن کی اصل عبارت میں بھری ہوئی ہے، اس کا

(۱) پردہ، ص ۱۳۷، ۱۳۸۔

کوئی حصہ ترجمے میں شامل نہیں ہونے پاتا۔ وہ اس چھلنی کے اوپر ہی سے اڑ جاتی ہے۔ حالاں کہ قرآن کی تاثیر میں اس کی پاکیزہ تعلیم اور اس کے عالی قدر مضامین کا جتنا حصہ ہے، اس کے ادب کا حصہ بھی اس سے کچھ کم نہیں ہے۔ یہی تو وہ چیز ہے جو سنگ دل سے سنگ دل آدمی کا دل بھی پگھلا دیتی تھی، جس نے بجلی کے کڑکے کی طرح عرب کی ساری زمین ہلا دی تھی، جس کی قوتِ تاثیر کا لوہا اس کے شدید ترین مخالفین تک مانتے تھے، اور ڈرتے تھے کہ یہ جادو اثر کلام جو سنے گا، وہ بالآخر نقدِ دل ہار بیٹھے گا۔ یہ چیز اگر قرآن میں نہ ہوتی اور وہ اسی طرح کی زبان میں نازل ہوا ہوتا جیسی اس کے ترجموں میں ہم کو ملتی ہے، تو اہلِ عرب کے دلوں کو گرمانے اور نرمانے میں اسے ہرگز وہ کام یابی نہ حاصل ہو سکتی جو فی الواقع اسے حاصل ہوئی۔(۱)

جدید اردو نثر کے اس بہترین نمونے میں علمی و ادبی طرزِ بیان کی بنیادی صفات یعنی فکر و خیال کی صحت و ہمواری اور الفاظ و معانی میں آہنگ و توازن بہ درجۂ اتم موجود ہے۔ اس لیے مولانا مودودی جب اس کا استعمال اپنے افکار و نظریات کی توضیح و تشریح کے لیے کرتے ہیں تو یہ بہ آسانی تخلیقی اور حکیمانہ اسلوب کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ مولانا نے ادبی زندگی کی مختلف منزلوں میں ادائے مطالب اور اظہارِ خیال کے لیے اسلوبِ تحریر کی ان صفات کو یکساں حسن و خوبی کے ساتھ برتا ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو نثر میں انھیں منفرد مقام حاصل ہے۔

مولانا مودودی کے ادبی مقام کا تعین کرنے کے لیے ان کی شخصیت کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

مولانا مودودی کی بنیادی حیثیت ایک مفکر و مدبر کی ہے۔ مفکر خلوت پسند ہوتا ہے۔ فکر اپنے اظہار کے لیے علمی اصطلاحات لانے پر مجبور ہے۔ مولانا کے یہاں عربی و فارسی اصطلاحات اسی وجہ سے ہیں لیکن ان اصطلاحات میں روانی اور سلاست زیادہ ہے۔ مولانا ایک عظیم صحافی بھی ہیں اور صحافی ہنگامی واقعات کو بھی آفاقی رنگ دینے پر مجبور ہوتا ہے لیکن ان کی صحافت میں مولانا آزاد کی خطیبانہ بلند آہنگی، طوفانی کیفیت اور پہاڑی ندی کا جوش و ولولہ نہیں ہے کہ راستے کے تمام پتھروں کو بہالے جائے۔ اس کے برعکس، مولانا مودودی کے یہاں تفہیم و تشریح، علمی و منطقی طرزِ استدلال اور عقل و فکر کی تسخیر کے لیے حکیمانہ اسلوب کی طلسم کاری ہے۔ یوں تو مولانا

---

(۱) تفہیم القرآن، اول، ص ۷۔

نے کم سنی میں شاعری بھی کی ہے، مگر وہ بنیادی طور سے ایک نثر نگار اور صاحبِ طرز نثر نگار تھے۔ انھوں نے شروع ہی میں نثر کو اس طرح اپنایا کہ آج بہت کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ انھوں نے کبھی شاعری بھی کی تھی۔ لطیف شعریت اور ذوقِ شعری ان کے مزاج میں رچ بس گئی تھی۔ مولانا کے دل و دماغ میں علوم کا دریا موج زن تھا۔ وہ درحقیقت ایک نبض شناس اور حساس فن کار تھے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا، اضطراب انگیز اور طوفان خیز فضاؤں میں سانس لیتے ہوئے لکھا۔ قومی وملّی تقاضوں نے ان پر دینی وسیاسی ذمے داریاں نہ ڈالی ہوتیں تو قلم کا یہ سپاہی کاروانِ ادب کا سالار ہوتا۔

طرزِ نگارش کی تعمیر وتہذیب میں شخصیت کا بڑا اہم رول ہوتا ہے۔ ماہرین نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اسلوب ہی شخصیت اور شخصیت ہی اسلوب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلوب شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کسی ادیب کی ادبی حیثیت کے تعین کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کے ادبی پس منظر اور ان محرکات کو پیش نظر رکھا جائے جو کسی ادبی تخلیق کو وجود میں لانے کا سبب ہوتے ہیں۔

اس کُلّیے کو سامنے رکھتے ہوئے، ہم مولانا مودودی کے ادبی پس منظر کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ادبی شخصیت کی تعمیر میں سب سے بڑا رول ان کے علمی و دینی گھرانے اور ماحول کا تھا، جہاں مولانا کی پرورش و پرداخت اور تعلیم وتربیت ہوئی۔ ایامِ طفلی ہی میں بڑے بھائی ابوالخیر مودودی (ادیب وصحافی)، والد محترم (صوفی منش بزرگ) اور ان کے مہذب اور سنجیدہ دوستوں کی صحبت اور شیخ سعدی کی گلستان و بوستان، مولانا حالی کے مقالات و مسدس اور مولانا آزاد کے الہلال اور البلاغ کے مطالعے نے ان کی علمی و ادبی شخصیت پر گہرے نقوش مرتب کیے۔ حیدرآباد اور دہلی جیسے گہوارۂ اردو میں ان کے قیام نے انھیں معیاری اردو زبان اور اس کے قواعد اور محاوروں سے آشنا کرایا۔ علامہ اقبال، نیاز فتح پوری، جوش ملیح آبادی اور مولانا محمد علی جوہر وغیرہ جیسی عظیم علمی و ادبی شخصیتوں سے ربط وتعلقات نے بھی ان کی شخصیت اور اسلوب کی تعمیر میں حصہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ، اردو نثر کے ادبِ عالیہ کے بالاستیعاب مطالعے نے انھیں معیاری علمی نثر اور اس کے اسالیبِ بیان سے واقف کرایا۔ مولانا مودودی کی شخصیت اور ان کا اسلوب اسی ذہنی اور ادبی پس منظر میں تیار ہوا ہے۔ دوسری طرف، مولانا مودودی ایک عظیم منصب پر فائز تھے۔ وہ ایک طرف اسلامی افکار و نظریات کی توضیح وتشریح اور تبلیغ و اشاعت میں سرگرم تھے، تو دوسری طرف تحریک اسلامی کی قیادت و رہ نمائی اور افرادِ تحریک کی تنظیم وتربیت

کا کام بھی کررہے تھے۔ اس طرح اسلامی افکار، دینی مزاج اور تحریکی سرگرمیوں نے بھی ان کی نثر کی شیرازہ بندی کی ہے۔ مولانا کے طرزِ تحریر میں توضیح و استدلال اور افہام و تفہیم اسی پس منظر سے ابھرا ہے اور ان سب سے بڑھ کر ان کی سنجیدہ و متین اور باوقار شخصیت نے ان کے اسلوبِ تحریر کو منفرد بنایا ہے۔ اسلوب، شخصیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ مولانا کی تحریروں میں متانت و سنجیدگی اور وقار و توازن ان کی ہمہ جہت شخصیت ہی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔

اردو نثر کی تاریخ میں علمائے دین اور صوفیائے کرام نے جس علمی و ادبی نثر کی شان دار روایت کی بنیاد رکھی اور جس کی آب یاری میں سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، مولانا حالی اور علامہ شبلی جیسے علم دوست اور صاحب طرز ادیبوں نے خونِ جگر صرف کیا اور بالآخر مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اسی طرزِ روش کو باقی رکھنے کی کوشش کی، اس سلسلے کی آخری کڑی مولانا مودودی کی تحریریں ہیں۔ انھوں نے اردو کی نثری روایت سے استفادہ تو ضرور کیا ہے، مگر وہ کسی کے مقلدِ محض نہیں تھے۔ ان کے اسلوب میں سرسید احمد اور مولانا الطاف حسین حالی کی سادگی و سلاست اور نفاست بھی ہے، اور علامہ شبلی نعمانی اور ابوالکلام آزاد کی فصاحت و بلاغت، شایستگی اور شگفتگی اور زورِ خطابت بھی ہے۔ کہنا چاہیے کہ مولانا مودودی کی نثر میں سرسید و حالی اور شبلی و آزاد کی نثری محاسن یک جا ہیں، اور یہی دراصل مولانا مودودی کی نثر کی انفرادی شان ہے۔

اردو زبان و ادب کے تحقیقی مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ روزِ اول سے ہندی، ایرانی اور بعض مغربی اثرات کے باوجود، اسلامی عقائد اور تہذیب و ثقافت کے اثرات سب پر حاوی رہے ہیں۔ بالخصوص ۱۸۵۷ کے آس پاس، برعظیم میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان احیائی تحریکوں کو فروغ حاصل ہوا تو انیسویں صدی کے آغاز ہی سے تحریکِ مجاہدین اور ملک گیر پیمانے پر مختلف اصلاحی تحریکوں نے بھی ہمارے ادب اور اسالیب نثر کو بڑی گہرائی سے متاثر کیا۔ سرسید، حالی، شبلی، آزاد اور اقبال نے قومی و ملی جذبے سے نشاۃِ ثانیہ اور اصلاحِ جدید کا خاکہ مرتب کیا۔ اس غرض کے لیے اردو نثر میں تسلسل کے ساتھ جو معنی خیز تجربے ہوئے، ان سے اردو نثر ثروت مند بھی پیدا ہوئی اور برگزیدہ بھی۔ مگر مولانا مودودی کی نثر نے اس تسلسل کو درجۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس طرح یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ اردو کے شعری ادب میں علامہ اقبال نے جو کارنامہ انجام دیا، وہی کارنامہ مولانا مودودی نے اردو کے نثری ادب میں انجام دیا۔

باب پنجم

حاصلِ کلام

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے بیسویں صدی کے ایک ایسے ماحول میں شعور کی آنکھیں کھولیں جب ہندستان پر برطانوی سامراج کا تسلط تھا، تحریکِ آزادیِ ہند کی سرگرمیاں تیز تھیں، فرقہ وارانہ منافرت پورے ملک کو متعفن کر رہی تھی۔ مسلمانوں میں تعلیمی و اخلاقی پستی، دین سے بے زاری اور احساسِ کم تری عام تھی۔ مغربی طرزِ تعلیم اور طرزِ معاشرت کو اختیار کرنا ہی روشن خیالی تصور کیا جاتا تھا۔ سائنسی ایجادات کا منفی اثر مذہبی عقائد پر پڑ رہا تھا اور فرائڈ کے نظریۂ جنس اور ڈارون کے نظریۂ ارتقا کا بہ راہِ راست اثر جہاں اس زمانے کی سماجی زندگی کے علاوہ ادب اور اصنافِ ادب قبول کر رہے تھے، وہیں دوسری طرف یہ نظریات ملک کے ہندو مسلم معاشرے کے اعلیٰ طبقوں میں مقبول ہو رہے تھے۔ مولانا مودودی نے دینی و علمی، سیاسی و معاشرتی اور فکری و نظریاتی اعتبار سے اس پر آشوب دور کا قریب سے مطالعہ و مشاہدہ کیا تھا، اور اس کے دور رس نتائج سے بھی بہ خوبی واقف تھے۔ خدا نے انھیں گونا گوں صلاحیتوں کے ساتھ تحریر و انشا کا ملکہ بھی ودیعت کیا تھا۔ جب ان کے حق آشنا قلم نے لکھنا شروع کیا تو ان تمام باطل افکار و نظریات اور امراضِ خبیثہ کو اپنا اولین نشانہ بنایا، ان پر ضربِ کلیمی سے ایسا وار کیا کہ ان کے پرخچے اڑا دیے۔ مولانا مودودی کا یہ وہ عظیم کارنامہ ہے، جس نے ان کی شخصیت کو ہمہ گیر، عالم گیر اور لافانی بنا دیا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی ان کے کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مولانا مودودی اس دور کے متکلمِ اسلام اور ایک بلند پایہ عالم دین ہیں۔ یورپ سے الحاد و دہریت کا سیلاب جو ہندستان میں آیا تھا، قدرت نے اس کے بند باندھنے

کاانتظام بھی ایسے مقدس اور پاک طینت ہاتھوں سے کرایا ہے جوخود یورپ کے جدید و قدیم خیالات سے نہایت ہی اعلیٰ طور پر کماحقہٗ واقفیت رکھتا ہے۔ پھراس کے ساتھ ہی وہ قرآن وسنت کا اتنا گہرااور واضح علم رکھتا ہے کہ موجودہ دور کے تمام مسائل پراس کی روشنی میں تشفی بخش طور پر گفتگو کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ملحدوں اور دہریوں نے اس شخص کے دلائل کے سامنے ڈگیں ڈال دی ہیں،اور یہ بات واضح طور پر کہی جاسکتی ہے کہ مودودی صاحب سے ہندستان اور عالمِ اسلام کے مسلمانوں کی بہت سی توقعاتِ دینی وابستہ ہیں۔(۱)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے سوانح حیات کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت ایک علمی اور مذہبی گھرانے میں ہوئی، جس کے گہرے نقوش ان کے دل و دماغ پر مرتسم ہوگئے۔ انھوں نے بچپن ہی میں مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا مطالعہ کرلیا تھا۔ انھوں نے اسکول میں مولوی عالم تک کی تعلیم حاصل کی، نام ور علماے کرام سے علومِ قرآن وحدیث، عربی صرف ونحو اور زبان وادب کا درس بھی لیا اور عصر جدید کے فلسفہ ومنطق اور نفسیات وعمرانیات کا بھی بہ غور مطالعہ کیا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں اعزازی پروفیسر رہے۔ مختلف اخباروں کی ادارت کی اور تادمِ آخر رسالہ ترجمان القرآن کی سرپرستی کی۔ جماعت اسلامی کی تاسیس اور قیادت بھی کی اور دار ورسن کی آزمایشوں سے بھی گزرے۔ متعدد عوارض جسمانی کے شکار بھی ہوئے،اوراسی دوران میں ارض القرآن کا عظیم علمی وتحقیقی سفر بھی کیا، تحریکی کارکنان کی تنظیم و تہذیب اور تربیت بھی کی اور اسلامی نشأتِ ثانیہ کے لیے ایک بے مثال لٹریچر بھی تیار کردیا۔ الغرض، مولانا مودودی کی پوری زندگی (۱۹۰۳-۱۹۷۹) خودداری، خود اعتمادی، شرافتِ نفس اور اسلامی اخلاقی اقدار کی پاس داری کرتے ہوئے جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم سے عبارت ہے۔

مولانا مودودی نے اپنی علمی وادبی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ ان کی پہلی اور مستقل ادبی حیثیت ایک صحافی کی ہے۔ انھوں نے مدینہ، تاج، مسلم اور الجمعیت کی ادارت کی۔ اس کے علاوہ وہ ملک کے مؤقر جریدوں اور رسالوں میں وقتاً فوقتاً تحقیقی وتنقیدی مقالوں کے ذریعے تخلیقی جوت جگاتے رہے۔ لیکن ان کی صحافتی زندگی کا اہم ترین اور لافانی دور ترجمان القرآن کی

(۱) ماہ نامہ تجلی، دیوبند سال نامہ ۱۹۷۱، ص ۲۴۹۔

ادارت کا ہے۔ یہ رسالہ ان کی علمی و دینی اور فکری و ادبی فتوحات کا امین ہے۔ یہ ان کے مخصوص فکر و نظر اور تحریکِ اسلامی کا ترجمان ہے۔ اس رسالے میں ان کی تقریباً تمام علمی و دینی اور ادبی تصنیفات اول اول شائع ہوئی ہیں۔ اس رسالے کے ذریعے انھوں نے وقت کے بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں، اور جدید ذہن کے شبہات کا تشفی بخش جواب دیا ہے۔ قرآن اور علومِ قرآن، حدیث و سیرت، تاریخ و تمدن، فلسفہ و سیاست، نیز، فقہی اور عصری مسائل اور حالاتِ حاضرہ پر تنقید و تبصرہ بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ، مولانا مودودی کا مدلل صحافتی لہجہ اور ان کے منفرد اسلوبِ نگارش نے وہ کارنامہ انجام دیا ہے جو بیسویں صدی کی کسی علمی و دینی رسالے کو نصیب نہ ہو سکا۔

اپنی صحافتی زندگی کے دوران ہی میں مولانا مودودی نے الجہاد فی الاسلام جیسی معرکہ آرا کتاب تصنیف کی، جو اپنے فکر و نظر اور اسلوبِ نگارش کے اعتبار سے منفرد اور لاثانی تصنیف ہے۔ ان کی تمام شہرۂ آفاق تصانیف مثلاً: پردہ، دینیات، تنقیحات اور تفہیمات وغیرہ اسی دوران منظرِ عام پر آئیں۔ اپنی صحافتی مصروفیتوں کے باوجود، ان کا تفسیرِ قرآن کا عظیم کارنامہ تفہیم القرآن کے نام سے شائع ہو کر دادِ تحسین پا چکا ہے۔ یہ قرآن کی ایک مستند اور متداول تفسیر ہے، جو جدید دور کے تقاضوں کے پیشِ نظر لکھی گئی ہے۔ تفہیم القرآن مولانا کے زندگی بھر کے مطالعے کا نچوڑ ہے۔ یہ تفسیر فنِ تفسیر اور اسلوبِ نگارش کے اعتبار سے برعظیم کی تمام اردو تفسیروں میں نمایاں ہے۔ یہ تفسیر نہ صرف سادہ و سلیس اور صاف و شفاف اردوے مبین کا بہترین نمونہ ہے بلکہ اردو زبان کی سنجیدہ و علمی نثر کا نقطۂ عروج بھی ہے۔

مولانا مودودی کی تخلیقات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے کم و بیش علومِ دین و ادبیات، فلسفہ و سیاست، تاریخ و تمدن، معیشت و معاشرت، سیرت و شخصیت، مغربی افکار و نظریات، جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے علاوہ، علومِ قدیم و جدید پر بھی مضامین لکھے ہیں۔ مولانا مودودی کا مطالعہ بڑا گہرا اور وسیع اور مشاہدہ بڑا عمیق، نیز، طرزِ استدلال بڑا حکیمانہ ہے۔ اس لیے ان کی تحریروں میں تنگ نظری اور کم مایگی کا احساس عنقا ہے۔

ادب درحقیقت بامقصد ہوتا ہے، اس لیے جتنا بڑا مقصد ادیب کے پیشِ نظر ہوگا، اتنا ہی بڑا ادب جنم لے گا۔ چوں کہ مولانا مودودی کا سب سے بڑا مقصد تجدید و احیاے دین تھا اس لیے ان کی تمام تخلیقات اس بڑے مقصد کے مرکز و محور کے گرد گھومتی ہیں۔ مولانا موصوف دراصل

ادب کے مقصدی نقطۂ نظر کے قائل تھے اور دین کی تبلیغ واشاعت اور اسلامی افکار ونظریات کی پیش کش کے لیے وہ ادب کو ایک مؤثر اور طاقت ور وسیلہ مانتے تھے، اس لیے ان کی تحریریں مقصدی، اخلاقی اور تعمیری ادب کی ترجمانی کرتی ہیں۔ مقصدی ادب کے انھی عناصر نے ان کے فن کی تشکیل وتعمیر کی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں مقصدیت اور خلوصِ فکر غالب عنصر کی طرح ہیں۔ ادب کے اسی مثبت نظریۂ ادب نے دنیاے ادب کو ایک نئے رجحان 'اسلامی ادب' سے آشنا کیا ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ مولانا مودودی نے اس نئی فکری و ادبی تحریک کی شیرازہ بندی کی ہے۔ لہٰذا، انھیں جدید اسلامی ادب کا معمارِ اول کہنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔

مولانا مودودی کے مخاطب یوں تو سماج اور معاشرے کا ہر طبقہ اور ہر فرد ہے لیکن انھوں نے بالخصوص تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں اور دانش وروں سے خطاب کیا ہے۔ مولانا نے انھیں اسلامی اخلاقی اقدار سے قریب کرنے اور ان کی تہذیب وتربیت کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک مشکل اور صبر آزما کام تھا، جس کے لیے مولانا اپنی تحریروں میں محکم دلائل، منطقی طرزِ استدلال اور جدید سائنٹی فک اسلوبِ تحریر کو بہ روے کار لائے ہیں۔ مولانا کے اس کارنامے کا اعتراف مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> واقعہ یہ ہے کہ اس جدید تعلیم یافتہ نسل پر ذہنی وعلمی طور پر مولانا مودودی نے گہرا اور نہایت وسیع اثر ڈالا ہے۔ انھوں نے اس نسل کی صدہا بے چین روحوں، ذہین اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اسلام سے قریب کرنے، بلکہ اس کا گرویدہ بنانے اور اس کے دل و دماغ میں اسلام کا اعتماد و وقار بحال کرنے کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ جہاں تک اس تعلیم یافتہ اور ذہین (Intellectual) طبقے کا تعلق ہے، اس اثر انگیزی میں (اس ربع یا نصف صدی میں) مشکل سے کوئی مسلمان مصنف ومفکر ان کا مقابل و ہم سر ملے گا۔(۱)

مختلف اصنافِ ادب اور موضوعات ومباحث میں اسلامی افکار ونظریات کی پیش کش، مقصدی، اخلاقی اور تعمیری ادب کی شیرازہ بندی اور فکر ونظر میں خلوص، صالحیت اور صلابت کے علاوہ، مولانا مودودی کی علمی وادبی اور نثری تخلیقات میں ان کا اسلوب اور طرزِ بیان خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیاے علم وادب میں انھیں کوئی مقام ومرتبہ حاصل ہے تو ان

---

(۱) تعمیر حیات، لکھنؤ۔

کے فطری اسلوب اور فکر و نظر کی دبازت کی وجہ سے ہے۔ مولانا موصوف کی طرزِ نگارش کے تار و پود ان کی شخصیت، علمیت، مقصدیت اور اخلاص و اخلاق سے بنے ہیں۔ ان سب کی ترکیب سے جس فکر و فن اور اسلوب کی تعمیر ہوئی ہے، اس میں انفرادی شان پیدا ہوگئی ہے۔ مولانا کی یہی انفرادیت انھیں ایک اچھا ادیب اور فن کار بناتی ہے۔

مولانا مودودی بنیادی طور پر ایک نثر نگار اور صاحبِ طرزِ نثر نگار تھے۔ انھوں نے اردو میں اعلیٰ اور معیاری نثر لکھی ہے۔ ان کی نثر اصلاً سادہ و سلیس اور شایستہ و نفیس ہے۔ ان کی زبان میں لطف و حلاوت اور چاشنی کے ساتھ بیان میں سنجیدگی اور متانت ہے۔ اور یہی ان کے اسلوب کی نمایاں صفت ہے۔ سادہ، آسان اور عام فہم الفاظ، رواں اور مروج محاورے ان کی تحریروں میں حسن پیدا کرتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں پیچیدگی اور ابہام، تکلف و تصنّع، بے جا تشبیہات و استعارات اور لفظی بازی گری نہیں ہے۔ اس کے باوجود، اسے خشک، سپاٹ اور سہلِ ممتنع نثر نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی ابتدائی چند تحریروں کو چھوڑ کر جن میں عربی و فارسی کے الفاظ و تراکیب استعمال ہوئی ہیں، بعد کی تمام تصنیفات اردو زبان کی معیاری، پختہ اور بالیدہ نثر کا نمونۂ کمال ہیں۔

مولانا مودودی کے اسلوب کی دوسری نمایاں خصوصیت وضاحت و صراحت ہے۔ اسلوب کا مقصد دراصل فکر و خیال اور معنی و مفہوم کا ترسیل و ابلاغ ہے۔ اس لحاظ سے مولانا کی تمام تحریریں ان کے افکار و خیالات کے ابلاغ و ترسیل کا ذریعہ ہیں۔ اس لیے یہ واضح، مدلل اور محکم ہیں۔ ان کی تحریروں میں موزوں و منتخب الفاظ، جملوں کی ترتیب و تنظیم، لفظ و معنی کا ربط و تعلق اور منطقی و استدلالی طرزِ اظہار، موضوع اور مضمون ایک واضح، صریح اور شفاف مرقع پیش کرتی ہیں۔ ان کے یہاں فکر و خیال اور اظہار و ابلاغ میں ربط و آہنگ ہے۔ اس لیے ان کی تحریروں میں ابہام، ہیجان اور جذباتیت نہیں ملتی ہے۔

مولانا مودودی کے اسلوب میں طنز و ظرافت کو خاص مقام حاصل ہے۔ چوں کہ مولانا تعمیر و تطہیرِ معاشرہ اور قیادت و سیادت کے منصب پر فائز تھے، اس لیے ان کی نگاہ ان تمام اخلاقی و عالمی مفاسد اور امراض خبیثہ پر تھی جو بالخصوص ملتِ اسلامیہ، اور بالعموم اقوام عالم کو تہ و بالا کر رہے تھے، اس لیے ان تمام کے خلاف انھوں نے بغیر خوفِ لومۃ لائم لکھا ہے۔ ان کی تحریروں میں طنز

کے تیر ونشتر اسی معرکہ آرائی کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے اردو اور انگریزی کے بعض الفاظ واصطلاحات، چست اور معنی خیز فقروں اور محاوروں کے ذریعے اس پر سخت ضرب کاری کی ہے اور دھاردار نشتر چلائے ہیں، مگر ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تہذیب وتوازن کا دامن نہیں چھوڑا۔

مولانا مودودی کے اسلوبِ نثر کی بعض جزوی خصوصیات اردو کے بعض دیگر اکابر کے ہاں بھی ملتی ہیں، لیکن شخصیت کی تعمیر اور اس کے مزاج کی تشکیل میں جو مختلف عوامل اپنا کام کرتے ہیں، نیز اس کے فکروفن کی اٹھان جو سمت اور رفتار اختیار کرتی ہے، ان سب کے نتیجے میں اسی جزوی خصوصیتیں جب کسی شخصیت میں ایک کل بن کے مجتمع ہوجاتی ہیں، تو پھر اس کا رنگ و آہنگ دوسروں سے خاصا مختلف ہوجاتا ہے۔ مولانا مودودی کی نثر کا اصل کمال یہ ہے کہ انھوں نے پوری یکسوئی، دل جمعی اور گہرے غوروفکر کے بعد ایک انقلابی نصب العین کو اختیار کر کے اردو دنیا کے فکرونظر میں انقلاب برپا کرنا چاہا۔ اس مقصد اور اس طرزِ اظہار کو نصف صدی سے زائد مدت تک وہ اپنا خونِ جگر صرف کر کے آگے بڑھاتے رہے۔ حالات کے تھپیڑوں نے ان کی توجہ اور شخصیت کو پارہ پارہ کرنے کی پیہم کوشش کی لیکن انھوں نے ذہنی، روحانی اور منفرد ادبی خصوصیات کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔ چناں چہ ان کا استدلالی، منطقی اور دل نشین طرزِ اظہار قارئین کے دل ودماغ کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔ اس اسلوبِ نثر میں جو منطقیت، نشتریت، روحانیت اور شعریت پائی جاتی ہے، وہ چیزے دگر ہے۔ ہمارے دیگر اکابرینِ نثر کے ہاں ان تمام خصوصیات کا ایسا حسین امتزاج ناپید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کا طرزِ بیان اردو کے اسالیبِ نثر میں 'اردوے مبین' کے منفرد نام سے منسوب ومعروف ہوا۔

کتابیات

الف: کتابیں

۱- آپ بیتی	مولانا عبدالماجد دریابادی	شاداب بک سنٹر، لاہور	۱۹۷۹
۲- ادبیات مودودی	پروفیسر خورشید احمد	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۷۶
۳- اردو کا ادیبِ عظیم	مولانا عبدالماجد دریابادی		
۴- اردو میں سوانح نگاری	سید شاہ علی	گلڈ گھر، کراچی	
۵- اسلامی نظامِ زندگی اور اس کے بنیادی تصورات	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۹۱
۶- اقبال اور مودودی	ابوراشد فاروقی	مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور	۱۹۸۰
۷- اقبال اور مودودی کا تقابلی مطالعہ	عمر حیات خان غوری	مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی	۱۹۸۱
۸- الجہاد فی الاسلام	سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	ادارہ ترجمان القرآن، لاہور	۲۰۰۵
۹- المودودی	نعیم صدیقی	ادارہ معارف اسلامی، لاہور	۱۹۸۶
۱۰- ایک شخص ایک کارواں	مجیب الرحمٰن شامی	قومی پبلشرز، لاہور	۱۹۸۰
۱۱- پردہ	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۲
۱۲- تحریکِ آزادی ہند اور مسلمان، اوّل	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۸۱
۱۳- تحریکِ آزادی ہند اور مسلمان، دوم	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۹۲
۱۴- تدبّر قرآن، ج ۴، ۶	مولانا امین احسن اصلاحی	مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور	
۱۵- ترجمان القرآن، دوم	مولانا ابوالکلام آزاد	مکتبہ اشاعت ادب، لاہور	س ن
۱۶- ترجمۂ قرآن مجید	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	ادارہ ترجمان القرآن، لاہور	۱۹۸۹
۱۷- تفسیر عثمانی	مولانا محمود حسن، شبیر احمد عثمانی	تاج کمپنی، کراچی	س ن
۱۸- تفہیمات، دوم	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۸۰
۱۹- تفہیم القرآن، ج ۱، ۴، ۵	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہو	
۲۰- تنقیحات	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۷۰
۲۱- تنقید اور تجربہ	ڈاکٹر جمیل جالبی		
۲۲- حیات جاوید	مولانا الطاف حسین حالی	قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی	
۲۳- خطبات	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۹۱
۲۴- خطوطِ مودودی، دوم	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سلیم منصور خالد	منشورات، لاہور	۱۹۹۵
۲۵- خلافت و ملوکیت	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	ادارہ ترجمان القرآن، لاہور	۲۰۰۲

۲۶-	دینیات	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	ادارہ ترجمان القرآن، لاہور	۲۰۰۵
۲۷-	رسائل و مسائل، چہارم	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	س ن
۲۸-	سود	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۹۶
۲۹-	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	علی سفیان آفاقی	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۹۱
۳۰-	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	پروفیسر محمد سلیم	فاران نشریات، لاہور	۱۹۹۲
۳۱-	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سوانح، افکار، تحریک	ابوالآفاق ایم اے	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۷۱
۳۲-	سید مودودی دعوت و تحریک	سید اسعد گیلانی	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۸۰
۳۳-	سید مودودی کا عہد	سید نقی علی	البدر پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۸۰
۳۴-	سیرت سرور عالم، اوّل	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	ادارہ ترجمان القرآن، لاہور	۱۹۷۸
۳۵-	شخصیات	سمیع اللہ، خالد ہمایوں (مرتب)	البدر پبلی کیشنز، لاہور	س ن
۳۶-	فن ترجمہ نگاری	ڈاکٹر خلیق انجم (مرتب)	انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی	۱۹۹۵
۳۷-	قدیم اردو	مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی	
۳۸-	قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر حمید شطاری		
۳۹-	گفتار و افکار	عاصم نعمانی	ادارہ معارف اسلامی، لاہور	۱۹۸۸
۴۰-	مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش، اوّل	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۴۰
۴۱-	مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش، سوم	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	
۴۲-	مسئلہ قومیت	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۳
۴۳-	معارف القرآن، ج۶، ۸	مفتی محمد شفیع	ادارۃ المعارف، کراچی	۱۹۸۲
۴۴-	معاشیات اسلام	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۱
۴۵-	مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی اوّل	عاصم نعمانی (مرتب)	ایوان ادب، لاہور	۱۹۷۰
۴۶-	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	احمد منیر (مرتب)	آتش فشاں پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۱
۴۷-	مولانا مودودی کی ادبی خدمات	پروفیسر عبدالمغنی	مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی	۱۹۹۲
۴۸-	مولانا مودودی کے خطوط	سید امین الحسن رضوی	مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی	۱۹۹۲
۴۹-	انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا			

(ب) رسائل و جرائد

۱- رسالہ الحسنات
۲- ماہ نامہ تجلی
۳- ماہ نامہ ترجمان القرآن
۴- تعمیر حیات
۵- سیارہ